یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

فلسفۂ معجزہ

آیۃ اللہ العظمیٰ
السیّد ابو القاسم الموسوی الخوئی
دام ظلہ العالی

الحسن بک ڈپو
مسجد باب العلم
نارتھ ناظم آباد، کراچی

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی۔ پاکستان

مؤلف ـــــ آیۃ اللہ الخوئی

مترجم ـــــ ایم۔ اے۔ انصاری

مدیر ـــــ رضا حسین رضوانی

مصحح ـــــ کاظم علی گجراتی

طبع ثالث ۱۹۸۹ء / ۱۴۰۹ھ

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اِسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندّیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد ابو القاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پُورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجّہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچّے بچّیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ہمارے علوم

علوم و فنون میں تخصّص اور ماہر خصوصی سے رجوع کرنے کا مسئلہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی باطنی اور فطری چیز ہے جو تمام مسائل اور موضوعات پر مسلّط ہے اور یہ ضروری ہے کہ ہر فن اس فن کے ماہر سے حاصل کیا جائے اور ہر علم کے لیے اسی علم کے استاد سے رجوع کیا جائے۔

قرآنِ مجید نے انسان کی اسی فطری ضرورت اور اندرونی خواہش کو پورا کرنے کے لیے خاندانِ وحی و نبوّت یعنی رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیتؑ کا تعارف قرآنی علوم کے ماہر اور استاد کی حیثیت سے کرایا ہے۔

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۷)

رسولِ اکرمؐ نے بھی انھیں قرآنِ مجید کا ساتھی اور اس کا مستحکم سہارا قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے قرآن کی تفسیر، اس کے علوم و احکام اور اسلام کے عقائد حاصل کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے یہ اعلان فرمایا ہے کہ اہلِ بیتؑ اور قرآن مجید، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دُوسرے کے رفیق ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے[1]۔

اہلِ بیتِ رسولؐ نے بھی ہمیشہ قرآنِ مجید کی پشت پناہی کی اور لاتعداد پابندیاں برداشت کرنے اور آزادی سے محروم رہنے کے باوجود مختلف علوم میں اور بالخصوص تفسیرِ قرآن میں ممتاز اور بلند پایہ شاگردوں کو تربیت دے کر اسلامی معاشرے کے سپرد کیا اور وہ عظیم ذمہ داری جو ان پر عائد ہوتی تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھایا۔

ایسے ماحول اور ایسے حالات میں جب کہ حدیث نقل کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور جو حدیثیں موجود تھیں انھیں جلا دیا گیا[2]۔

ایسے ماحول میں جب کہ حکومتِ وقت کی طرف سے گورنروں اور حکام کو تاکیدی احکام جاری کیے گئے کہ وہ اپنے زیرِ اختیار علاقوں میں حدیث نقل کرنے سے اجتناب برتیں اور فقط قرآنِ مجید کے الفاظ پڑھنے پر اکتفا کریں[3]۔

---

[1] حدیثِ ثقلین۔

[2] تذکرۃ الحفّاظ۔ جلد ۱ صفحات ۳ تا ۵ ۔ جامع بیان العلم وفضلہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۷۔

[3] سنن ابن ماجہ جلد ۱ باب ۳ ۔ طبقات ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۲ ۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۔

ایسے حالات میں جب خلفاء کے حکم سے کئی ایک صحابہ کو حدیث نقل کرنے کے جرم میں قید کر دیا گیا اور بعض دوسروں کو دور دراز مقامات پر جلا وطن کر دیا گیا۔[1]

جی ہاں! ایسے ماحول اور اس قسم کے حالات میں اہلبیتؑ رسولؐ نے احادیث جمع کرنے، لکھنے اور نقل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے فرزندوں اور ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ احادیث کو ضبطِ تحریر میں لاکر اور ایک شاندار تحفے کے طور پر آئندہ آنے والے مسلمانوں کے سپرد کر دیں۔

ان حالات میں جب کہ دوسرے لوگ قرآن مجید کے معارف غیروں سے حاصل کر رہے تھے اور توحید، معاد اور سابقہ پیغمبروں کے حالات کے بارے میں نازل شدہ آیات کی تفسیر کے لیے دوسروں کے دست نگر بن کر بے اصل حکایات اور اسرائیلیات کو قرآن مجید کی تفسیر کے طور پر پیش کر رہے تھے اور بعض لوگوں کی وضع کردہ روایات کا والہانہ استقبال کر رہے تھے، ہمارے پیشوا مسلمانوں کو توحید، حقیقی اسلامی عقائد اور قرآن مجید کی صحیح اور درست تفسیر کا درس دے رہے تھے، وہ اپنے پیروؤں کو کبھی آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی شکل میں اور کبھی خطبے اور دعا کے رنگ میں معارف اسلام سکھاتے تھے اور یوں انھوں نے عقائد، فقہ اور تفسیر کی ایک صحیح اور مستحکم بنیاد اپنے پیروؤں کو فراہم کی۔ اہلبیتؑ کے شیعوں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۷ - مجمع الزوائد جلد ۱ صفحہ ۱۴۹۔

اور پیروؤں نے بھی ان کے ارشادات کی پیروی کی اور تمام مواقع پر انھیں کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھایا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عقائد اور نظریات انھیں اصلی اور صحیح سرچشموں سے حاصل کیے اور انھیں آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

یہ مسلمہ حقیقت کہ جس کا اصلی مدارک اور مآخذ سے پتہ چلتا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ علوم، عقائد، تفسیر اور حدیث کے لحاظ سے شیعہ بے حد گرانبہا اور عظیم علمی سرمائے کے مالک ہیں اور اس سلسلے میں جو کچھ انھیں حاصل ہے، اس کا تعلق اہلِ بیتِ رسولؐ سے ہے اور اس کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے[1]۔ اہلبیتؑ سے شیعوں کا یہ تعلق اور احادیث نقل کرنے کا یہ سلسلہ کسی زمانے میں بھی منقطع نہیں ہوا اور اب بھی پوری آب و تاب سے جاری ہے، فقط یہی نہیں کہ ہر دور میں عظیم علمی اور مذہبی شخصیتیں اہلِ تشیّع میں سے اُبھریں جنھوں نے بیش بہا تصانیف بطور یادگار چھوڑیں بلکہ اکثر اسلامی علوم کے بانی بھی شیعہ علماء اور دانش ور ہی ہیں[2]۔

خوش قسمتی سے آج کل بھی اہلِ تشیّع میں ایسی بہت سی ممتاز اور قدآور شخصیتیں موجود ہیں کہ جن کی علمی اور فکری تصانیف پر دوسرے رشک کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم کئی ایک ایسے شیعہ اہلِ علم کو جانتے ہیں جن کی تصانیف شائع ہوتے ہی متعدد دوسری

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب سیری در صحیحین اور تاریخ تدوین حدیث از محمد صادق نجمی

[2] ملاحظہ ہو کتاب تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام از علامہ سید حسن حیدر

زبانوں میں ترجمہ ہو کر چھپ جاتی ہیں۔

ہمارا فرض

جب ہم علوم کے اتنے عظیم سرمائے کے مالک ہیں اور ہمارے پاس حدیث اور تفسیر کے ایسے اطمینان بخش اور اصلی منابع موجود ہیں کہ جن کی سَنَد کا سلسلہ اہلبیتِ رسولؐ اور معروف راویوں کے ذریعے وقت کے کسی فاصلے اور کسی وقفے کے بغیر رسولِ اکرمؐ اور سرچشمۂ وحی سے جا ملتا ہے تو پھر ہمارے لیے یہ کسی طور سے بھی مناسب نہیں کہ ہم دوسروں کی فکری میراث پر حریصانہ نظریں جمائیں اور علوم کے حصول کی خاطر غیروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں یا انھیں عظیم دانش ور تصوّر کرتے ہوئے شدید اشتیاق کے ساتھ ان کی کتابوں کا ترجمہ کریں اور انھیں آب و تاب کے ساتھ شائع کریں یا اپنی تصنیفات اور تالیفات میں فقط ان کے مدارک پر بھروسہ کریں اور علوم کا جو گرانبہا سرمایہ خود ہمارے پاس موجود ہے اس سے مکمّل طور پر غافل رہتے ہُوئے اسے نظر انداز کر دیں، اپنے مدارک اور منابع سے بے اعتنائی برتیں اور احساسِ کمتری کے زیرِ اثر انھیں بھلا بیٹھیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم دوسروں کے خیالات کی قدر و قیمت کے قائل ہی نہ ہوں اور ان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل نہ کریں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے عظیم اور گراں قدر علمی سرمائے پر بھی نظر رکھیں اور

اپنے آپ کو دُوسروں کے خیالات میں غرق نہ کردیں ۔ پس ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنی شناخت کرانے سے پہلے دوسروں کی علمیت کا ڈھنڈورا نہ پیٹیں ۔

جب ہمارے پاس علم کا ایک گرانبہا سرمایہ، قابلِ اعتماد تاریخ اور حدیث، ضخیم اور مفید کتابیں، کثیر فکری مصادر و منابع موجود ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ممتاز علماء، محققین اور مصنفین کی اس علمی دولت کی حفاظت کریں اور علم و دانش کا جو خزانہ ہمارے بزرگوں نے بڑی کاوشوں سے جمع کیا اور ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے اسے وسعت دیں، اپنے اہلِ علم کو بہتر طور پر پہچانیں اور ان کے افکار و نظریات کی اشاعت کریں۔

ایک بنیادی اور اعلیٰ مقصد

مذکورہ بالا مقصد کے تحت لوگوں کی توجہ اصلی اور مستحکم شیعہ علوم کی جانب منعطف کرانے، ان کا احساس کمتری دُور کرنے اور دوسروں کی جانب مائل ہونے کے رجحان کو روکنے کی خاطر **جامعہ تعلیماتِ اسلامی** نے ایک پروگرام تیار کیا ہے تاکہ ممتاز شیعہ علماء کی تحریر کردہ مفید علمی کتابوں کا سادہ انداز میں رواں ترجمہ کرکے عام مسلمانوں تک پہنچایا جائے تاکہ وہ اپنے گراں بہا علمی سرمائے اور اپنے علماء اور دانشوروں سے بہتر طور پر متعارف ہوں اور ان سے مستفید ہوسکیں ۔

اب تک اس سلسلے میں ادارۂ ہٰذا نے متعدد کتابیں انگریزی،

اردو، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں شائع کی ہیں اور بحمداللہ کتابوں کی دنیا میں انھوں نے ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب دُنیائے تشیّع کے مرجعِ اعلیٰ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ السیّد ابوالقاسم الموسوی الخوئی دام ظلّہ العالی کی مشہور تالیف البیان فی تفسیر القرآن کا ایک حصّہ ہے جو اُردو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

البیان فی تفسیر القرآن اہم قرآنی مسائل پر مشتمل ہے اور ہر مسلمان اور قرآن مجید کے پیرو کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل سے مکمل طور پر واقف ہو بلکہ بے حد مناسب ہوگا کہ اسے دینی درسگاہوں کے نصاب میں شامل کرکے طلباء کو درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جائے۔

اس کتاب کی عظمت

زیرِ نظر کتاب اس لحاظ سے بالخصوص بے حد اہم اور عظیم ہے کہ یہ قرآن مجید سے مخصوص ہے اور اس میں اس آسمانی کتاب کے اہم اور حسّاس نکات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب قرآن مجید کی عظمت، اس کی معجزانہ حیثیت اور بالخصوص اس کے علمی پہلوؤں کا صحیح صحیح تجزیہ کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ قرآن مجید ایک زندہ اور تعمیری کتاب ہے۔ یہ ایک ایسا جاودانی معجزہ ہے جو ابدالآباد تک لوگوں کی رہنمائی راہِ راست کی جانب کرتا رہے گا۔ مگر وہ اس رہنمائی کی بنیاد بھی عقل اور انسانی فطرت پر رکھتا ہے، اس طرح وہ

بنی نوع انسان کے کاروان کو انتہائے کمالات کی جانب آگے بڑھاتا ہے اور تمدّن اور انسانیت کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کے دوسرے معجزوں بلکہ تمام انبیاء کے معجزوں سے ممتاز اور بلند تر معجزہ ہے۔

ادارے کو یقین ہے کہ یہ کتاب ہمارے روشن خیال افراد کے ذہنوں کو جلا بخشے گی اور دینِ اسلام کو ایک عظیم مکتب اور قرآن کو ایک عظیم کتاب کی حیثیت سے روشناس کرائے گی۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

یوسف علی نفسی نجفی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن کی فضیلت و عظمت

بہتر یہی ہے کہ انسان قرآن کی عظمت اور اس کی شان کی رفعت پر گفتگو کرنے سے قبل ہی اپنے عجز اور بیچارگی کا اعتراف کرلے۔ شاید یہ اعتراف ہی ایسی جسارتِ بیجا سے بہتر ہے۔ آخر کوئی قرآن کی عظمت کے بارے میں کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ اور اس کے فضائل کا کیوں کر احاطہ کرسکتا ہے؟ قرآن واجبُ الوجود کا کلام ہے۔ پھر بیچارہ انسان کہ جو ممکن الوجود ہے، واجبُ الوجود کے کلام کی بلندیوں تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ کوئی مصنّف اس بارے میں کیا لکھ سکتا ہے اور کوئی خطیب اس باب میں کیا کہہ سکتا ہے؟ انسانی قابلیت محدود اور قرآن کے فضائل لامحدود۔ بات بنے تو کیسے بنے؟

قرآن کی عظمت و رفعت کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے

کلامُ اللہ کو دُوسرے ہر کلام پر وہی فوقیت اور برتری حاصل ہے جو اللہ کو اپنی مخلوق پر۔[۵]

واقعی بہتر یہی ہے کہ انسان اس میدان میں قدم ہی نہ رکھے اور قرآنی فضائل کا بیان ان پر چھوڑ دے جن کو قرآن کا ہمدوش قرار دیا گیا ہے، کیونکہ وہی سب سے زیادہ اس کی عظمت سے واقف ہیں اور وہی اس کے مرتبے کے بارے میں رہنمائی کر سکتے ہیں اِس لیے کہ وہ قرآن کے ساتھی اور ہدایت کے کام میں اس کے شریک ہیں۔

انھی کے جدّ امجد پر قرآن نازل ہوا، انھی کے جدِّ امجد نے اس کے احکام بیان کیے اور اس کی تعلیمات کو پھیلایا۔ چنانچہ قُرآن و اہلبیتؑ کے باہمی تعلق کے بارے میں ان کے جدِّ امجد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ

میں تمھارے درمیان دو عظیم امانتیں چھوڑ کر جا رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت یعنی اہلِ بیتؑ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس

---

[۵] بحار الانوار جلد ۱۹ صفحہ ۶۔ صحیح ترمذی بشرح ابن العربی جلد ۱۱ صفحہ ۴۷ ابواب فضائل القرآن۔

پہنچیں گے[1]

پس عترت رسولؐ اور اہلبیتِ رسولؑ ہی قرآن کی طرف رہنمائی کرنے کے اہل ہیں اور وہی اس کے فضل و کمال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم انھی کے اقوال پر انحصار کریں اور انھی کے ارشادات سے فیض یاب ہوں۔

قرآن کے فضائل کے بارے میں ائمہؑ اہلبیتؑ سے بکثرت احادیث مروی ہیں جن کو علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار کی انیسویں جلد میں جمع کر دیا ہے۔ ہم ان میں سے بعض روایات کے تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں:

حارث ہمدانی روایت کرتے ہیں:

دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ فَاِذَا اُنَاسٌ يَخُوضُونَ فِي اَحَادِيْثَ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَلِيٍّ فَقُلْتُ اَلَا تَرٰى اِنَّ اُنَاسًا يَخُوضُونَ فِي الْاَحَادِيْثَ فِي الْمَسْجِدِ؟ فَقَالَ قَدْ فَعَلُوهَا؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنِّي قَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ سَتَكُوْنُ فِتَنٌ قُلْتُ وَمَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا؟ قَالَ كِتَابُ اللّٰهِ، كِتَابُ اللّٰهِ فِيْهِ نَبَاُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ. هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ، هُوَ الَّذِيْ مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِي غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ،

---

[1] صحیح الترمذی جلد ۱۳ صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۱ مناقب اہل البیتؑ۔

فَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ وَهُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ وَهُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ اَنْ قَالُوْا "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا" هُوَ الَّذِيْ مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ اُجِرَ وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

میں ایک دن مسجد میں گیا تو دیکھا کہ لوگ باتوں میں مشغول ہیں۔ میں نے امام علی علیہ السلام سے جاکر کہا: آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ باتوں میں لگے ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا: کیا واقعی؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے: عنقریب فتنے برپا ہونگے۔ میں نے پوچھا کہ پھر ان سے بچنے کی کیا سبیل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کتاب اللہ۔ اس میں تمھارا اگلا پچھلا حال ہے، تمھارے جھگڑوں کا فیصلہ ہے، یہ قولِ فیصل ہے ہنسی مذاق نہیں۔ جو ظالم اسے چھوڑ دے گا اللہ اسے پاش پاش کردے گا۔ جو اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا وہ گمراہ ہوجائے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے، یہ ذکرِ حکیم اور صراطِ مستقیم ہے۔ خواہشاتِ نفسانی اسے

راہ سے بے راہ نہیں کرسکتیں - زبانیں اس میں شبہ نہیں ڈال سکتیں - عُلماء اس سے اکتاتے نہیں - قرآن کثرتِ استعمال سے گھسنے والا نہیں - اس کے عجائبات لامتناہی ہیں - جنّات نے جب اسے سُنا تو بے اختیار پکار اٹھے کہ "ہم نے حیرت انگیز قرآن سُنا ہے" جس نے قرآن کے مطابق کہا اس نے سچ بولا - جس نے قرآن کے مطابق فیصلہ دیا اس نے انصاف کیا - جس نے قرآن پر عمل کیا، اسے ثواب ملا - جس نے قرآن پر چلنے کی دعوت دی اس نے صحیح رہنمائی کی -[1]

یہ حدیث چند انتہائی اہم نکات پر مشتمل ہے - مناسب معلوم ہوتا ہے کچھ اہم باتیں بیان کردی جائیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ

اِس میں تمھارا اگلا پچھلا حال ہے - اِس جملہ کے مفہوم کے بارے میں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں - پہلا احتمال تو یہ کہ اس میں اشارہ ہو اخروی زندگی کی طرف جو عالمِ برزخ سے لے کر حساب کتاب اور اعمال کی جزا و سزا تک محیط ہے اور یہی مفہوم زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے - امیرالمؤمنین علیہ السلام کے ایک قول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے - آپ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا ہے :

---

[1] سنن الدارمی جلد ۲ صفحہ ۴۳۵ کتاب فضائل القرآن - صحیح الترمذی جلد ۱۱ صفحہ ۳۰ ابواب فضائل القرآن - بحار الانوار جلد ۹ صفحہ ۷ بنقل تفسیر العیاشی -

فِيهِ نَبَأُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ وَالْحُكْمُ فِيمَا بَيْنَكُمْ وَخَبَرُ مَعَادِكُمْ.

قرآن میں ان کے حالات ہیں جو تم سے پہلے گزرے اس میں تمہارے اختلافات کے بارے میں فیصلہ ہے اور تمہارے حشر ونشر کے بارے میں اطلاع ہے۔[1]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہو مستقبل کے ان واقعات کی طرف جن کی قرآن نے خبر دی ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ امّتوں کو جو حالات پیش آئے بعینہٖ وہ حالات اِس امت پر بھی گزریں گے۔ یعنی اس کا وہ مطلب ہو جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ہے:

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ.

تم لوگ بھی سابقہ امّتوں کے طور طریقوں میں ہوبہو پیروی کرو گے اور ان کی طرح حق سے انحراف، انبیاء کی تکذیب، عذر تراشی اور سرکشی کا راستہ — جو بالآخر یقینی بدبختی اور ہلاکت کا راستہ ہے — طے کرو گے۔

(سورۂ انشقاق۔ آیت ۱۹)

نیز نبی کریمؐ کی اِس حدیث کا کہ

لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ.

تم لوگ بھی پچھلے لوگوں کے ناپسندیدہ اور بیہودہ

---

[1] بحار الانوار جلد ۹ صفحہ ۶۔

طور طریقوں کو دوبارہ زندہ کرو گے اور انھی کی تقلید کرو گے[1]

یہ جو رسول اللہ ص نے فرمایا ہے کہ جو ظالم اسے چھوڑے گا اللہ اُسے پاش پاش کر دے گا۔ شاید اس میں اس بات کی ضمانت ہے کہ ظالم لوگ قرآن پاک کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے کہ اس کی تلاوت چھوٹ جائے اور اس پر عمل ترک ہو جائے اور نہ وہ ایسا کر سکیں گے کہ اس کے نسخے لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ اس طرح اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قرآن تحریف سے محفوظ رہے گا، یہی معنیٰ اس قول کے بھی ہیں کہ لَا تَزِیْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ یعنی خواہشاتِ نفسانی اسے راہ سے بے راہ نہیں کر سکتیں۔

بہ الفاظِ دیگر اس کی اصل عبارت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور اس کی واقعیت، حقائق اور احکام وہی ہیں جو روزِ اوّل تھے اور روزِ آخر تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی ورنہ معانی پر تو خواہشاتِ نفسانی ضرور اثر انداز بھی ہوئی ہیں اور انھوں نے معانی کو بدلا بھی ہے۔

اِس حدیث میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اگر امّت اپنے اختلافات کے تصفیہ کے لیے قرآن کو مشعلِ راہ بناتی اور عقائد و اعمال کے بارے میں جو شبہات پیدا ہوئے ان کے بارے میں قرآن کی طرف رجوع کرتی تو قرآن سب جھگڑوں کا منصفانہ فیصلہ کر دیتا اور

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۴۰۔

حق و باطل کا فرق بخوبی واضح ہوجاتا۔

واقعی یہ سچ ہے کہ اگر امت قرآنی تعلیمات کو ملحوظ رکھتی اور قرآن کے ارشادات اور اشارات سے رہنمائی حاصل کرتی تو وہ حق اور اہلِ حق کو پہچان لیتی اور اس پر یہ واضح ہوجاتا کہ اہلِ بیتؑ کہ جن کو خود رسولِ خداؐ نے کتابُ اللہ کا ہمدوش قرار دیا ہے، ان کے حقوق کیا ہیں اور دراصل وہی رسولِ اکرمؐ کے بعد ان کے خلیفہ برحق ہیں۔

اگر امّت قرآنی معارف سے روشنی حاصل کرتی تو دائمی عذاب اور انحطاط سے جو اس کو دامن گیر ہے محفوظ ہوجاتی، اندھیروں میں نہ بھٹکتی، گمراہیوں میں نہ گرفتار ہوتی، اللہ کے مقرر کردہ فرائض میں کوئی کمی نہ ہونے پاتی اور سیدھے راستے سے قدم نہ بھٹکتے۔ لیکن امّت رجعتِ قہقری سے نہ بچ سکی، نفسانی خواہشات کا اتباع کیے بغیر نہ رہ سکی اور باطل کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر رہ گئی۔ ہر ایک گروہ دوسرے گروہ کی تکفیر و تفسیق کرنے لگا اور ایک دوسرے کا خون بہانے، اہانت کرنے اور اس کا مال لوٹنے کو کارِ ثواب سمجھنے لگا۔ اس سے بڑھ کر قرآن کو چھوڑ دینے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے!

امیر المؤمنین علیہ السلام نے قرآن کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْهِ الْکِتَابَ نُوْرًا لَّا تُطْفَأُ مَصَابِیْحُهٗ

وَسِرَاجًا لَا يَخْبُوْ تَوَقُّدُهٗ وَبَحْرًا لَا يُدْرَكُ قَعْرُهٗ
وَمِنْهَاجًا لَا يُضِلُّ نَهْجُهٗ وَشُعَاعًا لَا يُظْلِمُ ضَوْءُهٗ وَ
فُرْقَانًا لَا يُخْمَدُ بُرْهَانُهٗ وَتِبْيَانًا لَا تُهْدَمُ اَرْكَانُهٗ
وَشِفَاءً لَا تُخْشٰى اَسْقَامُهٗ وَعِزًّا لَا تُهْزَمُ اَنْصَارُهٗ
وَحَقًّا لَا تُخْذَلُ اَعْوَانُهٗ فَهُوَ مَعْدِنُ الْاِيْمَانِ وَ
بُحْبُوْحَتُهٗ وَيَنَابِيْعُ الْعِلْمِ وَبُحُوْرُهٗ وَرِيَاضُ الْعَدْلِ
وَغُدْرَانُهٗ وَاَثَافِيُّ الْاِسْلَامِ وَبُنْيَانُهٗ وَاَوْدِيَةُ الْحَقِّ وَ
غِيْطَانُهٗ وَبَحْرٌ لَا يَنْزِفُهُ الْمُسْتَنْزِفُوْنَ وَعُيُوْنٌ
لَا يَنْضِبُهَا الْمَاتِحُوْنَ وَمَنَاهِلُ لَا يَغِيْضُهَا الْوَارِدُوْنَ
وَمَنَازِلُ لَا يَضِلُّ نَهْجَهَا الْمُسَافِرُوْنَ وَاَعْلَامٌ لَا يَعْمٰى
عَنْهَا السَّائِرُوْنَ وَاٰكَامٌ لَا يَجُوْزُ عَنْهَا الْقَاصِدُوْنَ
جَعَلَهُ اللّٰهُ رِيًّا لِعَطَشِ الْعُلَمَاءِ وَرَبِيْعًا لِقُلُوْبِ الْفُقَهَاءِ
وَمَحَاجَّ لِطُرُقِ الصُّلَحَاءِ وَدَوَاءً لَيْسَ بَعْدَهٗ دَاءٌ
وَنُوْرًا لَيْسَ مَعَهٗ ظُلْمَةٌ وَحَبْلًا وَثِيْقًا عُرْوَتُهٗ وَمَعْقِلًا
مَنِيْعًا ذِرْوَتُهٗ وَعِزًّا لِمَنْ تَوَلَّاهُ وَسِلْمًا لِمَنْ دَخَلَهٗ
وَهُدًى لِمَنِ ائْتَمَّ بِهٖ وَعُذْرًا لِمَنِ انْتَحَلَهٗ وَبُرْهَانًا
لِمَنْ تَكَلَّمَ بِهٖ وَشَاهِدًا لِمَنْ خَاصَمَ بِهٖ وَفَلْجًا لِمَنْ
حَاجَّ بِهٖ وَحَامِلًا لِمَنْ حَمَلَهٗ وَمَطِيَّةً لِمَنْ اَعْمَلَهٗ
وَاٰيَةً لِمَنْ تَوَسَّمَ وَجُنَّةً لِمَنِ اسْتَلْاَمَ وَعِلْمًا لِمَنْ
وَعٰى وَحَدِيْثًا لِمَنْ رَوٰى وَحُكْمًا لِمَنْ قَضٰى.

قرآن ایسی روشنی ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں ، ایسا چراغ ہے جس کی لو ماند نہیں پڑتی ، ایسا سمندر ہے جس کی تہہ کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا، ایسی شاہراہ ہے جس کی راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی ، ایسی شعاع ہے جس کی چمک کم نہیں ہوتی ، حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ایسا معیار ہے کہ اس کے دلائل کمزور نہیں پڑتے ، ایسا بیان ہے جس کے اصول متزلزل نہیں کیے جاسکتے ، ایسی شفا ہے کہ پھر بیماری کا خدشہ نہیں، ایسی عزّت اور سربلندی ہے جس کے حامی شکست نہیں کھاتے ، ایسا حق ہے جس کے مددگار ذلیل نہیں ہوتے ،

قرآن ایمان کا معدن اور مرکز ہے۔ اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں ۔ اس میں عدل کے چمن اور حوض ہیں ۔

قرآن اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے۔ حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے ، وہ دریا ہے جس کا پانی کسی کے ختم کیے ختم نہیں ہوسکتا ، ایسا چشمہ ہے کہ پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کرسکتے، ایسا گھاٹ ہے کہ اس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا ، ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی رہرو بھٹک نہیں سکتا۔

قرآن نشانِ راہ ہے جو راہ گیر کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔

ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے۔

قرآن وہ کتاب ہے جسے خدا نے علماء کی پیاس بجھانے فقہاء کے دلوں کو خوش کرنے اور صلحاء کا آخری مقصد قرار دیا ہے۔

قرآن ایسی دوا ہے جس کے بعد کوئی درد نہیں رہتا، ایسی روشنی ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ہوتا، ایسی رسّی ہے جس کے بل مضبوط ہیں، ایسا قلعہ ہے جس کی پناہ گاہ محفوظ ہے، جو اس کا ساتھ دے گا عزّت پائے گا، جو اس میں داخل ہوگا امان میں رہے گا، جو اس کا اتباع کرے گا ہدایت پائے گا، جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لیے حجّت ہے، جو اس کو گفتگو میں استعمال کرے اس کے لیے دلیل ہے، جو اس کی بنیاد پر بحث مباحثہ کرے اس کے لیے گواہ ہے، جو اسے حجّت بنا کر پیش کرے اس کے لیے فتح و کامرانی ہے، جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے۔

قرآن رہنما ہے اس کے لیے جو سوچ بچار کرتا ہو اور ڈھال ہے اس کے لیے جو ضلالت سے ٹکرانے کے لیے ہتھیار بند ہو، علم ہے اس کے لیے جو ہدایت کو گرہ میں باندھ لے، بہتر کلام ہے اس کے لیے جو اسے بیان کرے اور قطعی حکم ہے اس کے لیے جو اس کے مطابق

فیصلہ کرے[1]

یہ خطبہ نہایت اہم امور پر مشتمل ہے جن کا جاننا اور ان پر غور وفکر کرنا ضروری ہے :-

قرآن ایسا چراغ ہے جس کی لَو ماند نہیں پڑتی۔ اس جملہ اور دوسرے کئی جملوں سے امام علی علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین کبھی پرانے نہیں ہوں گے اور یہ کہ تا قیامِ قیامت ان کی تروتازگی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

مثلاً کوئی آیت کسی خاص موقعہ پر یا کسی خاص شخص یا گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہو وہ اس موقع یا اس شخص یا اس گروہ سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ باعتبارِ معنیٰ عام ہوتی ہے۔

چنانچہ عیاشی نے اپنی سند سے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے آیتِ قرآنی لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورۂ رعد آیت ۱۳) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا :

عَلِيٌّ : اَلْهَادِي، وَمِنَّا الْهَادِي، فَقُلْتُ : فَاَنْتَ جُعِلْتُ فِدَاكَ الْهَادِي. قَالَ صَدَقْتَ اِنَّ الْقُرْاٰنَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ، وَالْاٰيَةُ حَيَّةٌ لَا تَمُوْتُ، فَلَوْكَانَتِ الْاٰيَةُ اِذَا نَزَلَتْ فِي الْاَقْوَامِ وَمَاتُوْا مَاتَتِ الْاٰيَةُ لَمَاتَ الْقُرْاٰنُ وَلٰكِنْ هِيَ جَارِيَةٌ فِي الْبَاقِيْنَ كَمَا جَرَتْ فِي الْمَاضِيْنَ .

---

[1] نہج البلاغہ، يَعْلَمُ عَجِيْجَ الْوُحُوْشِ کے الفاظ سے شروع ہونے والا خطبہ۔

ہادی سے مراد علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں اور ہادی ہر زمانے میں ہم اہلبیتؑ میں سے ہوں گے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا کہ میری جان آپ پر قربان! آپ بھی تو اس آیت میں شامل اور اس کے مصداق ہیں، اور آپ بھی تو ان ہادیوں اور رہبروں میں سے ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

تم صحیح کہہ رہے ہو، میں بھی اس آیت کا مصداق اور اس میں شامل ہوں کیونکہ قرآن زندہ ہے، یہ کبھی نہیں مرے گا اور یہ آیت بھی زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گی۔ اگر ایسا ہوتا کہ جو آیت کسی خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہو وہ اس گروہ کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوجایا کرتی تو اب تک قرآن مرچکا ہوتا لیکن قرآن اگلوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوتا ہے جیسے پچھلوں پر۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

إِنَّ الْقُرْآنَ حَيٌّ لَمْ يَمُتْ، وَإِنَّهُ يَجْرِي كَمَا يَجْرِي اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ، وَكَمَا تَجْرِي الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، وَيَجْرِي عَلَىٰ آخِرِنَا كَمَا يَجْرِي عَلَىٰ أَوَّلِنَا.

قرآن زندہ ہے، ختم نہیں ہوا۔ اسی طرح جاری وساری ہے جیسے دن رات اور چاند سورج۔ یہ ہمارے بعد آنے والوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوتا ہے جیسے ہم سے

پہلوں پر۔

کافی میں روایت ہے کہ عمر بن یزید نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کیا مراد ہے :

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

مومنین وہ لوگ ہیں جو اس تعلق کو قائم رکھتے ہیں جس کو قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

(سورۂ رعد۔ آیت ۲۱)

امام ؑ نے فرمایا :

هٰذِهٖ نَزَلَتْ فِيْ رَحِمِ اٰلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ وَقَدْ تَكُوْنُ فِيْ قَرَابَتِكَ ، فَلَا تَكُوْنَنَّ مِمَّنْ يَّقُوْلُ لِلشَّيْءِ : اِنَّهٗ فِيْ شَيْءٍ وَّاحِدٍ .

یہ آیت آلِ محمد ؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن تمھارے رشتہ دار بھی اس کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ تم ان لوگوں کی روش مت اختیار کرو جو کسی بات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک ہی چیز کے بارے میں ہے۔

تفسیر فرات میں ہے :

"اگر یہ باور کر لیا جائے کہ کوئی آیت جو کسی خاص قوم کے بارے میں نازل ہوئی تھی ، اس قوم کے ختم ہو جانے سے ختم ہو گئی تو قرآن میں کچھ بھی باقی نہ رہے ، اس لیے یہ بات صحیح نہیں بلکہ قرآن رہتی دنیا تک اوّل و آخر سب پر حاوی ہے۔ ہر قوم کے متعلق آیت ہے جس کو

وہ پڑھ سکتی ہے۔ اس میں بھلائی برائی سب کا بیان ہے۔"[1]

قرآن ایسی شاہراہ ہے جس کی راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسا راستہ دکھاتا ہے جس پر چلنے والا بھٹک نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے نازل کیا ہے، چنانچہ جو اس کا اتباع کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے محفوظ رکھے گا۔

قرآن ایسا بیان ہے جس کے اصول متزلزل نہیں کیے جا سکتے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآنی تعلیمات اور قرآن میں بیان شدہ حقائق و معارف غیر متزلزل ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآنی الفاظ میں کسی طرح خلل آنے اور کمی بیشی ہونے کا احتمال نہیں۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن تحریف سے محفوظ رہے گا۔

قرآن میں عدل کے چمن اور حوض ہیں کا مطلب یہ ہے کہ کتابُ اللہ میں عقیدہ، عمل اور اخلاق میں عدل و اعتدال کے تمام پہلو موجود ہیں اور یہ عدل کے تمام پہلوؤں کا سنگم ہے۔

قرآن اسلام کا سنگِ بنیاد اور اس کی اساس ہے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام، قرآن ہی کی وجہ سے قائم ہے جیسے مکان کو اس کی بنیاد کے پتھر ایک خاص طریقے سے قائم رکھتے ہیں۔

---

[1] مرآۃ الانوار صفحہ ۳-۴

قرآن حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے سے

مراد یہ ہے کہ قرآن وہ مقام ہے جہاں حق سرسبز ہوتا ہے۔ یہاں قرآن کو وسیع اور ہموار اراضی سے تشبیہ دی گئی ہے اور حق کو اس پر اگنے والے سبزہ سے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص قرآن کی پیروی نہیں کرتا وہ حق پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن ہی ہے جہاں سے حق ابھرتا اور پروان چڑھتا ہے۔ قرآن کے علاوہ اور کہیں حق نہیں ہے۔

قرآن وہ دریا ہے جس کا پانی کسی کے ختم کیے ختم نہیں ہو سکتا۔ اِس جملے اور ما بعد کے جملوں کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کے تمام معانی کا احاطہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے معانی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے معانی میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی جس طرح چشموں کا پانی وہاں سے پانی لینے سے کم نہیں ہوتا۔

قرآن ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اس کتاب کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا کہ ان سے آگے بڑھ جائے۔ اس قول میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن میں ایسے معانی پنہاں ہیں کہ ان تک فہم انسانی کی کامل رسائی ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ بھی مطلب ہو کہ جب کوئی اِن معانی کی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے تو وہ وہیں رک جاتا ہے اور کسی دوسری طرف جانے کا قصد نہیں کرتا کیونکہ اس کے مقصد کی پوری طرح تکمیل ہو جاتی ہے۔

تلاوتِ قرآن کی فضیلت

قرآن پاک ایسا الٰہی قانون ہے جو دین اور دُنیا میں لوگوں کی اصلاح کا کفیل اور ان کی دنیوی و اخروی سعادت کا ضامن ہے، اس کی ہر آیت ہدایت کا سرچشمہ اور رحمت کا منبع ہے۔ لہٰذا جس کسی کو دائمی سعادت کا حصول اور دین و دنیا کی فلاح وکامیابی عزیز ہو اس کا فرض ہے کہ دن اور رات میں کسی بھی وقت کتاب الٰہی سے غافل نہ ہو، اس کی آیاتِ بیّنات کا دھیان رکھے اور اپنی سوچ کو اس کے سانچے میں ڈھال لے تاکہ قرآنِ کریم کی روشنی میں ایسی کامیابی حاصل کر سکے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ کیونکہ یہی وہ تجارت ہے جس میں گھاٹے کا امکان نہیں۔

ائمہؑ اہلبیت علیہم السلام اور ان کے جدِّ امجد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تلاوتِ قرآن کی فضیلت میں جو احادیث مروی ہیں ان میں سے چند ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ :
مَنْ قَرَأَ عَشْرَ اٰيَاتٍ فِيْ لَيْلَةٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ خَمْسِيْنَ اٰيَةً كُتِبَ مِنَ الذَّاكِرِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ مِائَةَ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ مِائَتَيْ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْخَاشِعِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ ثَلَاثَمِائَةِ اٰيَةٍ

كُتِبَ مِنَ الْفَائِزِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ خَمْسَمِائَةِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَمَنْ قَرَأَ اَلْفَ آيَةٍ كُتِبَ لَهٗ قِنْطَارٌ مِنْ تِبْرٍ ....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:
جو شخص ہر روز رات کو دس آیات کی تلاوت کرے گا اس کا شمار غافلین میں نہیں ہوگا اور جو پچاس آیات کی تلاوت کرے گا اس کا نام ذاکرین میں لکھا جائے گا، جو سو آیات کی تلاوت کرے گا اس کا نام خاشعین میں لکھا جائے گا اور جو پانچ سو آیات کی تلاوت کرے گا اس کا نام عابدین میں لکھا جائے گا اور جو ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے راہِ خدا میں خالص سونے کا ایک ڈھیر خیرات کیا ہو۔" [1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْقُرْاٰنُ عَهْدُ اللّٰهِ اِلٰى خَلْقِهٖ فَقَدْ يَنْبَغِىْ لِلْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اَنْ يَّنْظُرَ فِىْ عَهْدِهٖ، وَاَنْ يَّقْرَاَ مِنْهُ فِىْ كُلِّ يَوْمٍ خَمْسِيْنَ اٰيَةً۔

قرآن انسانوں کی زندگی اور سعادت کا دستور العمل

---

[1] اصول الکافی کتاب فضل القرآن ۔ وسائل الشیعہ مطبوعہ عین الدولہ جلد ا صفحہ ۳۷۰

ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے بنایا ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنی ذمّے داری کا خیال رکھے اور ہر روز قرآن کی پچاس آیات کی تلاوت کرے۔[1]

ایک اور موقع پر آپؑ نے فرمایا:

مَا يَمْنَعُ التَّاجِرَ مِنْكُمُ الْمَشْغُوْلَ فِيْ سُوْقِهٖ إِذَا رَجَعَ إِلٰى مَنْزِلِهٖ أَنْ لَّا يَنَامَ حَتّٰى يَقْرَأَ سُوْرَةً مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَتُكْتَبُ لَهٗ مَكَانَ كُلِّ اٰيَةٍ يَقْرَأُهَا عَشْرُ حَسَنَاتٍ، وَيُمْحٰى عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ.

آخر اس میں کیا دشواری ہے کہ کوئی تاجر جو بازار میں اپنے کاروبار میں مصروف رہتا ہے، واپس آکر اس وقت تک نہ سوئے جب تک قرآن کی ایک سورت نہ پڑھ لے؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو ہر آیت کے عوض دس نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی اور دس برائیاں اس کے نامۂ اعمال سے مٹا دی جائیں گی۔[2]

نیز آپؑ نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ، فَإِنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلٰى عَدَدِ اٰيَاتِ الْقُرْاٰنِ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يُقَالُ لِقَارِئِ الْقُرْاٰنِ: اِقْرَأْ وَارْقَ، فَكُلَّمَا قَرَأَ

---

[1] و [2] اصول الکافی، کتاب فضل القرآن۔ وسائل الشیعہ مطبوعہ عین الدولہ جلد ا صفحہ ۳۷۰۔

اٰیَةً رَقِیَ دَرَجَةً۔

قرآن کی تلاوت ضرور کرو کیونکہ جتنی قرآن کی آیتیں ہیں اتنے ہی جنت میں درجے ہیں۔قیامت کے دن قرآن پڑھنے والے کو حکم ہوگا کہ پڑھتا جا اور ترقی کرتا جا۔جب وہ ایک آیت پڑھے گا تو اس کا ایک درجہ بلند ہو جائے گا[1]

کتبِ حدیث میں اس طرح کی روایات بکثرت ہیں جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔بحار الانوار کی انیسویں جلد میں ایسی روایات کی بڑی تعداد جمع کر دی گئی ہے۔

ان میں بہت سی روایات ایسی ہیں جن میں قرآن مجید کو حفظ پڑھنے کے مقابلے میں ناظرہ پڑھنے کی فضیلت آئی ہے۔ جیساکہ اسحاق بن عمّار کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا:

جُعِلْتُ فِدَاكَ اِنِّیْ اَحْفَظُ الْقُرْاٰنَ عَنْ ظَهْرِ قَلْبِیْ فَاَقْرَاَهٗ عَنْ ظَهْرِ قَلْبِیْ اَفْضَلُ اَوْ اَنْظُرُ فِی الْمُصْحَفِ؟ قَالَ: فَقَالَ لِیْ: لَا بَلْ اِقْرَاْهُ وَانْظُرْ فِی الْمُصْحَفِ فَهُوَ اَفْضَلُ . اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ النَّظَرَ فِی الْمُصْحَفِ عِبَادَةٌ؟

میری جان آپ پر صدقے! مجھے قرآن حفظ ہے۔میں

---

[1] اصول الکافی، کتاب فضل القرآن ۔وسائل الشیعہ مطبوعہ عین الدولہ جلد ا صفحہ ۳۷۰

قرآن حفظ پڑھوں تو بہتر ہے یا ناظرہ پڑھوں تو زیادہ اچھا ہے؟

امامؑ نے فرمایا:

ناظرہ قرآن پڑھنا افضل ہے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ قرآن میں دیکھنا بھی عبادت ہے۔

نیز امامؑ نے فرمایا:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي الْمُصْحَفِ مُتِّعَ بِبَصَرِهِ وَ خُفِّفَ عَنْ وَّالِدَيْهِ وَإِنْ كَانَا كَافِرَيْنِ.

جو قرآن میں دیکھ کر پڑھتا ہے، اسے بینائی عطا ہوتی ہے اور اس کے والدین خواہ کافر بھی ہوں، ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے[1]

ناظرہ قرآن پڑھنے کی ترغیب میں ایک بڑا نکتہ پوشیدہ ہے جس کی طرف توجّہ کی ضرورت ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نسخے بکثرت موجود ہوں۔ اگر صرف حفظ کرنے کا رواج ہو جائے تو قرآنِ کریم کے نسخوں کی طرف سے لوگ غفلت برتنے لگیں گے، اس طرح ان کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور شاید رفتہ رفتہ وہ معدوم ہی ہو جائیں۔

اس کے علاوہ دیکھ کر پڑھنے کے اور بھی بہت سے فائدے

---

[1] اصول الکافی، کتاب فضل القرآن۔ وسائل الشیعہ مطبوعہ عین الدولہ جلد ا صفحہ ۳۷۰

ہیں کہ جن کی احادیث میں تصریح موجود ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے کہ "اس سے بینائی عطا ہوتی ہے"۔ یہ فقرہ جوامع الکلم ہے، یعنی اس کے متعدد معنیٰ ہو سکتے ہیں :۔ ایک تو یہ کہ دیکھ کر پڑھنا نگاہ کی کمزوری اور امراضِ چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ دیکھ کر پڑھنے سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور قرآن کے اہم مطالب اور باریک نکات سمجھ میں آنے لگتے ہیں، کیونکہ یہ عام قاعدہ ہے کہ دِل آویز چیز دیکھ کر آدمی کے دل کو سُرور حاصل ہوتا ہے جس سے اس کی نظر اور بصیرت میں جولانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کی تلاوت کرنے والا جب اس کے الفاظ پر نظر ڈالتا ہے اور اس کے بلند معانی اور قیمتی معلومات پر غور کرتا ہے تو اس کے اندر فرحت وانبساط کی ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ رُوحانی خوشی محسوس کرتا ہے اور اس کے دِل کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

احادیث میں گھروں میں قرآن پڑھنے کی جو فضیلت آئی ہے اس میں یہی راز ہے کہ اس طرح اسلام کی شان ظاہر ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی تلاوت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گھر میں قرآن شریف پڑھتا ہے تو لامحالہ اس کے بیوی بچّے بھی پڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح تلاوت کا شوق بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ اگر قرآن کی تلاوت کے لیے کچھ مقام مخصوص کر دیے جائیں تو ہر شخص کو ہر وقت تلاوت کی سہولت میسر نہیں ہو گی حالانکہ تلاوتِ قرآن کو اسلام کی اشاعت میں بڑا دخل ہے۔ شاید

اس میں ایک اور راز بھی ہے اور وہ ہے ایک دینی شعار کا قیام۔ کیونکہ جب صبح و شام گھروں سے قرآن پڑھنے کی آوازیں بلند ہوں گی تو خواہ نخواہ سننے والوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت قائم ہوگی اور وہ ہر بستی میں قرآن پڑھنے والوں کی آوازوں سے متاثر ہوں گے۔

گھروں میں قرآن کی تلاوت کے اثر کے متعلق احادیث میں ہے کہ

إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي يُقْرَأُ فِيهِ الْقُرْآنُ وَيُذْكَرُ اللّٰهُ تَعَالَىٰ فِيهِ تَكْثُرُ بَرَكَتُهُ وَتَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ، وَتَهْجُرُهُ الشَّيَاطِينُ وَيُضِيءُ لِأَهْلِ السَّمَاءِ كَمَا يُضِيءُ الْكَوَاكِبُ الدُّرِّيُّ لِأَهْلِ الْأَرْضِ، وَإِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي لَا يُقْرَأُ فِيهِ الْقُرْآنُ وَلَا يُذْكَرُ اللّٰهُ تَعَالَىٰ فِيهِ تَقِلُّ بَرَكَتُهُ وَتَهْجُرُهُ الْمَلَائِكَةُ، وَتَحْضُرُهُ الشَّيَاطِينُ.

جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے اور اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہاں خیر و برکت میں اضافہ ہوتا ہے، اس گھر میں فرشتے آتے ہیں اور وہاں سے شیطان بھاگ جاتے ہیں۔ آسمان والوں کو وہ گھر ایسا چمکتا ہوا نظر آتا ہے جیسا زمین والوں کو کوئی ستارہ۔ جس گھر میں قرآن نہیں پڑھا جاتا اور اللہ کا نام نہیں لیا جاتا، اس کی برکت کم ہو جاتی ہے، فرشتے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور وہاں

شیطان بسیرا کر لیتے ہیں[1]

احادیث میں قرآن کی فضیلت اور اس کی تلاوت کے ثواب کے بارے میں بڑے حیرت انگیز مضامین آئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَلَهٗ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حَرْفٌ وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ.

جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اسے ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے۔ بلکہ الف ایک الگ حرف ہے لام ایک الگ حرف اور میم ایک الگ حرف ہے۔

یہ حدیث اہل سنت کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ قرطبی[2] نے ترمذی سے ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے اور کلینی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے تقریباً یہی الفاظ روایت کیے ہیں۔ کتب حدیث کا تتبع کرنے والے کو قرآن اور اس کی تلاوت کے فضائل اور مختلف سورتوں اور آیتوں کے خواص کے بارے میں اس طرح کی احادیث بکثرت مل سکتی ہیں۔

لیکن کچھ دروغ گو راویوں نے ان احادیث کو بھی ناکافی سمجھا۔

---

[1] اصول الکافی، کتاب فضل القرآن۔

[2] تفسیر القرطبی جلد ۱ صفحہ ۷۔ اصول الکافی کتاب فضل القرآن۔

انھوں نے اپنی طرف سے قرآن اور اس کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں ایسی روایتیں گھڑ دیں جن کی قرآن وحدیث میں کوئی سَنَد نہیں - ان راویوں میں ایسے لوگ ہیں جیسے ابو عصمت فرج بن ابی مریم مروزی ، محمد بن عکاشہ کرمانی اور احمد بن عبداللہ جویباری ۔

ابو عصمت مروزی نے تو خود اس کا اعتراف کیا ہے ، جب اس سے پوچھا گیا کہ تمھیں قرآن کی ایک ایک سورت کے فضائل میں عَنْ عِکْرِمَۃَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ والی حدیث کہاں سے ملی جبکہ تم اس کے ہم زمان نہیں رہے ہو تو اس نے کہا :

"میں نے دیکھا کہ قرآن کی طرف لوگوں کی توجّہ نہیں رہی بلکہ ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی پر ساری توجّہ مرکوز ہوگئی ہے تو میں نے ثواب کی خاطر یہ حدیث وضع کی ہے ۔"

قرآن کی ایک ایک سورت کے فضائل کے بارے میں جو حدیث عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ؐ کہہ کر روایت کی گئی ہے ، اس کے متعلق ابو عمرو عثمان بن صلاح نے کہا ہے :

"ایک محقّق نے اس حدیث کی اصل دریافت کرنے کی کوشش کی تو اسے اس شخص کا پتا چل گیا جس نے اعتراف کیا کہ اس نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر یہ حدیث وضع کی ہے - واحدی اور کچھ دوسرے مفسّرین نے غلطی سے اسے اپنی تفاسیر میں درج کر دیا ۔"

(تفسیر القرطبی ، جلد ا صفحہ ۷۸-۷۹)

اللہ کی جناب میں ان گستاخ لوگوں کی جرأت دیکھیے کہ وہ جھوٹ گھڑ کر پیغمبر خداؐ سے منسوب کرتے ہیں، مزید برآں اس کو نیکی سمجھ کر اس پر ثواب کی امید بھی رکھتے ہیں:

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

اِن حد سے گزرنے والوں کو اپنی بُری حرکتیں اسی طرح پسندیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ (سورۂ یونسؑ۔ آیت ۱۲)

قرآن کے معانی میں غور و فکر

کتابُ اللہ اور سُنّتِ صحیحہ میں قرآن کے معانی میں تفکّر و تدبّر اور اس کے اعلیٰ مقاصد کو اچھی طرح سمجھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا.

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟ (سورۂ محمدؐ۔ آیت ۲۴)

اِس آیت میں قرآن پر غور و فکر نہ کرنے والوں کی شدید مذمّت کی گئی ہے۔ حدیث میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا:

اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَهٗ.

قرآن کو بلند آواز سے پڑھو اور اس کے پوشیدہ معانی اور عجائب و دقائق تلاش کرو۔

ابو عبدالرحمٰن سُلَمی سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں:۔

"جو صحابہ ہمیں پڑھایا کرتے تھے انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک وقت میں دس آیات پڑھتے تھے اور آنحضرت ص اگلی دس آیات اس وقت تک نہیں پڑھاتے تھے جب تک ہم پہلی دس آیات کے علمی اور عملی تمام پہلوؤں سے واقفیت حاصل نہیں کر لیتے تھے۔" [1]

عثمان، ابن مسعود اور اُبیؓ سے روایت ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہم کو دس آیات پڑھاتے تھے اور اگلی دس آیات اس وقت تک نہیں پڑھاتے تھے جب تک ہم پہلی دس آیات کے مضامین پر پوری طرح عمل کرنا نہیں سیکھ لیتے تھے۔ اس طرح رسولِ خدا ص قرآن بھی پڑھاتے تھے اور اس پر عمل کرنا بھی سکھاتے تھے۔" [2]

ایک دن امام علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جابر بن عبداللہ انصاری کا تذکرہ کیا اور ان کے علم کی تعریف کی۔ کسی شخص نے کہا:

"یا امیر المؤمنین ع! آپ جابر کے علم کی تعریف کر رہے ہیں حالانکہ علم و فضل میں کوئی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

امیر المومنین ع نے فرمایا:

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۹ صفحہ ۲۸ باب فضل التدبّر فی القرآن۔

[2] تفسیر القرطبی جلد ۱ صفحہ ۳۹

"جابر اس تعریف کے حقدار ہیں کیونکہ ان کو

آیتِ کریمہ:

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ. (سورۂ قصص۔ آیت ۸۵)

کی تفسیر معلوم تھی" [1]

قرآن پر غور و فکر کی فضیلت میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں جن کی ایک بڑی تعداد علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی انیسویں جلد میں جمع کر دی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اخبار و آثار کے تتبع کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن وہ کتاب ہے جو نازل ہی اس لیے کی گئی ہے کہ لوگ اس کے بتلائے ہوئے نظام کی پیروی کریں اور دنیا اور آخرت میں اس روشنی سے فیضیاب ہوں۔ یہ بات تو معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ مقصد قرآن کے معانی پر غور و فکر کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن پر غور و فکر کے بارے میں جو آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں وہ صرف اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

اِس بارے میں زہری کہتے ہیں کہ میں نے امام زین العابدین علیہ السلام کو یہ کہتے سنا ہے کہ

"آيَاتُ الْقُرْآنِ خَزَائِنُ فَكُلَّمَا فُتِحَتْ خِزَانَةٌ يَنْبَغِي لَكَ أَنْ تَنْظُرَ مَا فِيهَا."

---

[1] تفسیر القرطبی جلد ا صفحہ ۲۶

”قرآن کی آیات خزانے ہیں۔ جب تم کوئی خزانہ کھولو تو تمھیں چاہیے کہ دیکھ لو کہ اس میں کیا ہے“ [1]

---

[1] اصول الکافی، کتاب فضل القرآن۔

اعجازِ قرآن

لُغت میں اعجاز کے متعدد معنیٰ بیان کیے گئے ہیں مثلاً کوئی کام نہ کرسکنا۔ کسی کو کسی کام کے ناقابل پانا۔ کسی کو کسی کام کے ناقابل بنا دینا یا معذور کردینا — مگر علمِ کلام کی اصطلاح میں اعجاز کا مطلب ہے کہ کوئی مامور من اللہ ہونے کا مدعی اپنے دعوے کی سچائی میں کوئی ایسا مافوق الفطرت کارنامہ پیش کرے جو کوئی دُوسرا پیش نہ کرسکے۔

ایک ایسا کارنامہ کہ جس سے دُوسرے عاجز ہوں صرف اسی صورت میں کسی مدّعی کے دعوے کی صحّت ثابت کرسکتا ہے جب کہ عقلی طور انسان کے لیے ایسا دعویٰ کرنے کا امکان بھی موجود ہو، ورنہ اگر اس کا دعویٰ عقلاً ناقابلِ قبول ہو اور نبی یا

امامِ معصوم کے قول کے خلاف ہو تو پھر یہ کارنامہ اس کی صداقت کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص خدائی کا دعویٰ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ عقلاً ناقابلِ قبول ہے کیونکہ ایسے دعوے کی صداقت کے باطل اور محال ہونے پر ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد موجود ہیں۔

دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد نبوّت کا دعویٰ کرے۔ ایسا دعویٰ بھی یقیناً جھوٹ اور غلط ہے کیونکہ خود پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے خلفائے معصومینؑ کے مستند اقوال کے مطابق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم النبیّین ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اگر بنیادی طور پر دعویٰ ہی باطل ہو تو اس کا ثبوت کیا کام دے سکتا ہے؟ اگر مدّعی کا دعویٰ عقلاً یا نقلاً غلط ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اس کے دعوے کو ناکام بنا کر اس کا بطلان ثابت کرے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منصوص من اللہ ہونے کا کوئی مدعی ایک ایسا کارنامہ پیش کرتا ہے جس سے دوسرے انسان عاجز ہوں، لیکن خود یہی کارنامہ اس کے کاذب ہونے کا ثبوت بن جاتا ہے:-

کہا جاتا ہے کہ مسیلمہ نے ایک ایسے کنویں میں جس میں پانی کم تھا اس لیے تھوکا کہ اس کا پانی بڑھ جائے لیکن ہوا یہ کہ رہا سہا پانی بھی کنویں کی تہہ میں اتر گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس نے بنی حنیفہ کے کچھ بچّوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے مُنہ

میں انگلی ڈالی۔ جن بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا وہ گنجے ہو گئے اور جن کے منہ میں انگلی ڈالی تھی وہ تتلانے لگے۔[1]

اگر کوئی مدعی اس طرح کا معجزہ دکھاتا ہے تو اللہ جلّ شانہ' کے لیے اس کا ناکام بنانا ضروری نہیں، اس لیے کہ ایسا کارنامہ خود ہی اس کے دعوے کے بطلان کے لیے کافی ہے اور اس کو اصطلاحاً معجزہ بھی نہیں کہا جاتا۔

جادوگر اور شعبدہ باز جو کرتب دکھاتے ہیں وہ بھی اصطلاحاً معجزہ نہیں۔ اسی طرح سائنسی علوم کے جاننے والے جو کارنامے انجام دیتے ہیں انھیں بھی معجزہ نہیں کہا جاسکتا خواہ کوئی دوسرا ایسا کارنامہ انجام نہ بھی دے سکے۔ جب کسی کارنامے کا تعلق قدرتی اسباب و نتائج سے ہو جیسے جادو، شعبدہ وغیرہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا ابطال ضروری نہیں، گو یہ کارنامہ دکھانے والا یہی دعویٰ کیوں نہ کرے کہ وہ مامور من اللہ ہے اور اپنے کارنامے کو اپنے دعوے کے ثبوت میں ہی کیوں نہ پیش کرے۔

علوم طبیعیہ کی بنیاد ایسے قوانین پر ہے جو ان علوم کے جاننے والوں کو معلوم ہیں اور ان قوانین کے مطابق نتیجہ نکلنا بالکل فطری ہے چاہے ان علوم کی عملی تطبیق کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ اسی طرح علم طب کے حیرت انگیز کارناموں کا تعلق بھی اشیاء کی قدرتی تاثیر سے ہے گو یہ تاثیر عام لوگوں کو معلوم نہ ہو اور چاہے

[1] الکامل، ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۸۔

خود اطباّر بھی اس سے بے خبر ہوں۔

اِس میں کوئی قباحت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی خاص بندے کو کسی مخصوص شے کا ایسا دقیق علم عطا کردے جو عام لوگوں کی رسائی سے باہر ہو، قباحت اِس میں ہے کہ وہ کسی جاہل کو اس بات کا موقع دے کہ وہ لوگوں کو اپنی جہالت کے جال میں پھنسا سکے یا کسی جھوٹے کے ہاتھ سے ایسا معجزہ ظاہر ہونے دے جس سے وہ مخلوق کو گمراہ کر سکے۔

نبی کے لیے معجزہ ضروری ہے

قطعی اور واضح دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ سُبحانہٗ انسانوں کے لیے احکام نازل فرماتا ہے کیونکہ انسان اپنے اِرتقار اور دین و دُنیا میں فوز و فلاح کے لیے ان احکام کے محتاج ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنے احکام کی بجاآوری کا مکلّف نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو انھیں احکام کی ضرورت نہیں یا پھر وہ خود ان کی ضرورت سے بے خبر ہے تاہم یہ محال ہے کیونکہ اس سے جہل لازم آئے گا جبکہ اللہ سُبحانہ وتعالیٰ جہل سے بَری ہے یا پھر یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ انسان کمال اور کامیابی حاصل کرسکیں جس کے معنیٰ یہ ہُوئے کہ اللہ تعالیٰ بخیل ہے۔ تاہم یہ بات اس لیے ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ فیاّضِ مطلق ہے۔ یا پھر یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو احکام کا مکلّف بنانے کی کوشش تو کی لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ لیکن یہ بات بھی غَلط ہے کیوں کہ

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے احکام نازل فرمائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ انسانوں ہی میں سے کوئی شخص ایسا ہو جو یہ احکام لوگوں تک پہنچائے اور ان احکام کی ضروری وضاحت کرے:

لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ ۔

تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ حق کی حجّت تمام ہو جانے کے بعد برباد ہو اور جسے زندگی پانا ہو وہ ہدایت کی حجّت تمام ہونے کے بعد زندگی پائے۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۴۲)

یہ بھی ظاہر ہے کہ مامور من اللہ کا منصب اتنا عظیم ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس کا دعویٰ کرنے کی خواہش ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے صادق و کاذب اور ہادی و مُضل میں اشتباہ واقع ہونے کا امکان ہے، اس لیے ضروری ہوا کہ جو شخص مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی واضح نشانی پیش کرے، چونکہ وہ نشانی کوئی معمولی قسم کا ایسا کام نہیں ہوسکتا جو دوسرے بھی کرسکتے ہوں، اس لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ وہ نشانی کوئی خارق العادت اور مافوق الفطرت کارنامہ ہو۔

بنابریں مامور من اللہ ہونے کے مدعی کی صداقت کی دلیل کوئی معجزہ ہی ہوسکتا ہے کیونکہ معجزہ ہی ایسا مافوق الفطرت کارنامہ ہے جس کو کوئی شخص اللہ کی خاص عنایت اور مخصوص مدد کے بغیر نہیں دکھا سکتا۔ اگر کسی جھوٹے مدعیٔ نبوّت کو اللہ معجزہ دکھانے کی قوت عطا

کر دے تو اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ اللہ نے اسے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے اور باطل کو سربلند کرنے کی طاقت دے دی، مگر یہ بات خدا کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہے، اس لیے اگر نبوّت کا دعویٰ کرنے والے کے ہاتھ سے کسی معجزے کا ظہور ہوتا ہے تو وہ بلاشبہ اس کی صداقت کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ اس کی نبوّت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

یہ ایسا قاعدۂ کلّیہ ہے جس پر عُقلاء اس قسم کے اُمور میں ہمیشہ عمل کرتے ہیں اور اس میں انھیں کوئی شک نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بادشاہ نے اسے رعایا سے متعلق کسی کام کے لیے اپنا نمائندہ مقرّر کیا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دعوے کی تائید میں دلیل پیش کرے اور دلیل بھی ایسی ہو جو قطعی اور واضح ہو۔ اب اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میرے سچّے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کل بادشاہ میرا اسی طرح استقبال کرے گا جس طرح وہ اپنے دوسرے نمائندوں اور سفیروں کا کرتا ہے۔ پھر بادشاہ کو رعایا سے اس شخص کی اس گفتگو کا علم بھی ہو جائے اور اس کے باوجود وہ وقتِ معیّنہ پر اس کا استقبال کرے تو بادشاہ کا یہ فعل اس شخص کے قول کی تصدیق متصوّر ہوگا کیونکہ یہ رعایا کے مفاد کے محافظ طاقتور بادشاہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ مُدّعی جھوٹا ہے اور رعایا کو دھوکا دے رہا ہے اس کی تصدیق کرے۔

جب ایسا فعل کسی بھی باہوش انسان سے سرزد نہیں ہوسکتا تو پھر یہ حکیم مطلق کی شان کے تو سراسر خلاف اور محال ہے۔ اللہ

سبحانہ نے خود قرآن کریم میں فرمایا ہے :

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ . لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ . ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ .

اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ کچھ جھوٹی باتیں لگاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر ان کی رگِ جان کاٹ ڈالتے ۔ (سورۂ حاقّہ ۔ آیات ۴۴ تا ۴۶)

اِس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ حضرت محمدؐ جن کی نبوّت کو ہم نے ثابت کیا ہے اور جن کی تصدیق کے لیے معجزہ ظاہر کیا ہے وہ ہم سے کوئی قول غلط طور پر منسوب کریں ، اگر وہ ایسا کرتے تو ہم ان کا ہاتھ پکڑ لیتے اور ان کی رگِ جان کاٹ دیتے کیونکہ کسی ایسے غلط قول پر ہمارا سکوت ، اس کی منظوری اور پسندیدگی کی علامت اور شریعت میں جو سراسر ہدایت ہے باطل کو داخل کرنے کی اجازت کے مترادف ہے ۔ حالانکہ شریعت کی حفاظت ہر مرحلے میں ہمارے لیے لازمی ہے ، اس کے قیام کے مرحلے میں بھی اور اس کو برقرار رکھنے کے مرحلے میں بھی ۔

معجزے کا کسی مدعیٔ نبوّت کی صداقت کی دلیل ہونا اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس بات کا فیصلہ عقل کرتی ہے کہ کونسی بات صحیح اور اچھی ہے اور کونسی بات بُری اور غلط ہے ۔ لیکن اشاعرہ[1] اس کو نہیں مانتے ، ان کے نزدیک عقل ایسا

---

[1] ابوالحسن اشعری (۲۷۰ ۔ ۳۲۰ ہجری) کہ جو ابوعلی محمد بن عبدالوہاب الجبائی

کرنے کی مجاز نہیں لہٰذا ان کے قول کی بنا پر نبوّت کی تصدیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ تاہم معجزہ نبوت کی تصدیق کی دلیل اسی وقت بن سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ کسی جھوٹے مدعی سے معجزے کا ظہور عقلاً ممکن نہیں۔ اگر عقل یہ فیصلہ نہیں کرسکتی، تو صادق و کاذب میں تمیز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

فضل بن روزبہان نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ اگرچہ کسی غلط اور قبیح فعل کا صدور اللہ سے ممکن ہے لیکن عادت و مشیتِ الٰہی یوں جاری ہے کہ معجزہ سچّے نبی ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور جھوٹے مدّعیٔ نبوّت کے ہاتھ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ اس طرح

کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئے مکتبِ فکر کی بُنیاد ڈالی جو اُسی کے نام سے منسوب ہوکر "اشعری" کہلایا۔

اشاعرہ کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ قرآن مجید قدیم ہے۔

۲۔ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ یعنی وہ صحیح اور غلط اعمال کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے تمام اعمال پہلے سے مقدّر کیے ہوئے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔

عقیدۂ جبر کی بنا پر چونکہ اشاعرہ انسان کو فاعلِ مختار نہیں سمجھتے اس لیے وہ یزید بن معاویہ اور دُوسرے خلفاء کے بُرے اعمال کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (ناشر)

اشاعرہ کے قول سے نبوّت کی تصدیق کا دروازہ تو بند نہیں ہوتا لیکن
اِس جواب کی کمزوری اور رکاکت عیاں ہے :-

اوّلاً : عادت ومشیتِ الٰہی جس کا ابن روز بہان نے تذکرہ کیا ہے کوئی ایسی چیز نہیں جس کو محسوس کیا جاسکے یا دیکھا، سُنا جاسکے ۔

ثانیاً : اس عادت ومشیت الٰہی کے ثبوت کا انحصار انبیائے سابقین کو ماننے پر ہے کہ جنھوں نے معجزات دکھائے لیکن جو لوگ انبیاء کا انکار کرتے ہیں یا جو اِن کی صداقت میں شک کرتے ہیں ان کو کسی طرح بھی اِس عادتِ الٰہی کا قائل نہیں کیا جاسکتا جس کا دعویٰ ابن روز بہان نے کیا ہے ۔ لہٰذا ان کے لیے معجزہ حجّت نہ ہُوا ۔

ثالثاً : اگر عقلی لحاظ سے کسی کام کا کرنا یا نہ کرنا برابر ہو اور عقل کو صحیح اور غلط کے فیصلہ کا اختیار نہ ہو تو پھر اللہ کو اپنی عادت بدلنے میں کیا چیز مانع ہوسکتی ہے ؟ اللہ تعالیٰ تو قادرِ مطلق ہے ۔ اس سے یہ نہیں پُوچھا جاسکتا کہ اس نے کیا کِیا اور کیوں کِیا ۔

رابعاً : عادت کا مدار کسی فعل کے بار بار صادر ہونے پر ہے اور اس کے لیے ایک مدّتِ دراز درکار ہوتی ہے ۔ اس بنا پر اس عادت کے استقرار سے پہلے مثلاً پہلی نبوّت کے ثبوت کی کیا دلیل ہوگی ؟

مُعجزہ کی عصری فنون سے مشابہت

جیسا کہ معلوم ہے کہ معجزہ ایسا مافوق الفطرت کارنامہ ہے جسے کوئی مدّعی اپنے من جانب اللہ مامور ہونے کے ثبوت میں پیش کرے اور جس کا جواب پیش کرنے سے تمام بنی نوع انسان قاصر ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن کو اس معجزہ سے مشابہ فن سے کما حقہٗ واقفیت ہو اس لیے کہ کسی فن کے ماہرین ہی اس کی باریکیوں اور خوبیوں کو پہچان سکتے ہیں اور اس کی خصوصیات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو ہی معلوم ہوتا ہے کہ کونسا کارنامہ ایسا ہے کہ اس جیسا کارنامہ انجام دینا انسان کے بس میں ہے اور کونسا کارنامہ ایسا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین فن ہی سب سے پہلے معجزے کی تصدیق کرتے ہیں۔ رہے عامی، تو وہ چونکہ فن کی مبادیات سے ناواقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے واسطے شک کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مدعیٔ نبوّت صرف ان باتوں پر اعتماد کرے جو کسی فن کے خواص ہی کو معلوم ہوں تو وہ مشکل ہی سے لوگوں کو قائل کر سکے گا، اس لیے حکمتِ خداوندی کا تقاضا یہ ہُوا کہ ہر نبی کو وہ معجزہ عطا کیا جائے جو اس فن سے مشابہ ہو جو اس کے زمانے میں عام طور پر مروّج ہو اور جس کے جاننے والے اس زمانے میں بکثرت ہوں کیونکہ وہ اسی طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جلد اور آسانی سے قائل کر سکتا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر

مناسب یہی تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ عطا ہو کیونکہ ان کے زمانے میں جادو کا چرچا عام تھا اور جادوگر کثرت سے موجود تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے جادوگروں نے ہی ان کے معجزے کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے۔ جب جادوگروں نے دیکھا کہ عصا سانپ بن کر ان کی جادوگری کے پُرفریب سامان کو نگل لیتا ہے اور پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ جاتا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ یہ بات جادو کے بس کی نہیں۔ پھر جیسے ہی انھیں یقین ہو گیا کہ یہ معجزۂ خداوندی ہے انھوں نے فرعون کے غیظ و غضب اور اس کی دھمکیوں کی پروا کیے بغیر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں طبِّ یونانی کو فروغ حاصل تھا۔ ان کے زمانے کے اطبّاء مریضوں کو حیرت انگیز طور پر شفایاب کرتے تھے۔ ان دنوں شام اور فلسطین میں بھی طب ہی کا غلغلہ تھا کیونکہ یہ دونوں علاقے یُونان کی نوآبادیاں تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا نبی بنا کر ان ملکوں میں مبعوث فرمایا تو اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہُوا کہ انھیں ایسا معجزہ عطا کیا جائے جو وہاں کے طبّی کارناموں سے مشابہت رکھتا ہو۔ چنانچہ ان کے معجزوں میں مُردوں کو زندہ کرنا، پیدائشی اندھوں اور برص کے بیماروں کو اچھّا کرنا شامل تھا تاکہ اس زمانے کے لوگ دیکھ سکیں کہ یہ وہ معجزہ ہے جو انسانی طاقت سے باہر ہے اور اس کا طبّی قوانین سے کوئی تعلّق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ سرحدِ ادراک سے کہیں دُور واقع ہے۔

عربوں کو فصاحت و بلاغت میں امتیازی مقام حاصل تھا اور

انھوں نے فنونِ ادب میں مہارت پیدا کی تھی۔ ان کے یہاں شعر گوئی اور خطابت کی مجالس منعقد ہوتی تھیں اور بازار لگتے تھے۔ جو شخص محاسنِ کلام میں جس قدر ترقی کرتا تھا اتنی ہی اس کی عزت کی جاتی تھی۔ شعر کی قدردانی کا یہ عالم تھا کہ قدیم شعراء کے سات بہترین قصائد (معلّقات السبعہ) آبِ زر سے کتان کے کپڑے پر لکھ کر خانۂ کعبہ پر آویزاں کر دیے گئے تھے۔ کسی شاعر کے بہترین اشعار کو اس کے سنہری اشعار کہا جاتا تھا[۵۱]

عربوں میں مرد اور عورت دونوں ہی شعر و سخن کے شیدائی تھے، نابغۂ ذبیانی کو شعر کا سب سے بڑا نقّاد سمجھا جاتا تھا۔ حج کے موسم میں جب وہ آتا تو عکّاظ کے بازار میں اس کے لیے سُرخ چمڑے کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا، جہاں شعراء آکر اسے اپنا کلام سُناتے تھے اور وہ ان پر اپنا فیصلہ دیتا تھا[۵۲]

ان حالات میں حکمتِ خداوندی کا تقاضا یہ ہوا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کو زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کا معجزہ عطا ہو، تاکہ ہر عرب یہ سمجھ سکے کہ یہ خُدا کا کلام ہے اور انسان کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ ہٹ دھرم لوگوں کو چھوڑ کر ہر عرب اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

یہی حقیقت اس روایت میں بیان کی گئی ہے جو ابنِ سکیت

---

۵۱ ابن رشیق: العمدہ جلد ۱ صفحہ ۷۸۔

۵۲ شعراء النصرانیہ جلد ۲ صفحہ ۶۴۰ مطبوعہ بیروت۔

سے مروی ہے کہ اس نے امام علی رضا علیہ السلام سے پوچھا :

لِمَاذَا بَعَثَ اللّٰهُ مُوسَى بْنَ عِمْرَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْعَصَا وَيَدِهِ الْبَيْضَاءِ وَآلَةِ السِّحْرِ ؟ وَبَعَثَ عِيسَى بِآلَةِ الطِّبِّ ؟ وَبَعَثَ مُحَمَّدًا ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ وَعَلَى جَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ ـ بِالْكَلَامِ وَالْخُطَبِ؟

فَقَالَ أَبُو الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ :

إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا بَعَثَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ الْغَالِبُ عَلَى أَهْلِ عَصْرِهِ السِّحْرُ. فَأَتَاهُمْ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بِمَا لَمْ يَكُنْ فِي وُسْعِهِمْ مِّثْلُهُ وَمَا أَبْطَلَ بِهِ سِحْرَهُمْ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ.

وَإِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي وَقْتٍ قَدْ ظَهَرَتْ فِيهِ الزَّمَانَاتُ وَاحْتَاجَ النَّاسُ إِلَى الطِّبِّ فَأَتَاهُمْ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ بِمَا لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُمْ مِثْلُهُ، وَبِمَا أَحْيَى لَهُمُ الْمَوْتَى، وَأَبْرَأَ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ.

وَإِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ فِي وَقْتٍ كَانَ الْغَالِبُ عَلَى أَهْلِ عَصْرِهِ الْخُطَبُ وَالْكَلَامُ ـ وَأَظُنُّهُ قَالَ : الشِّعْرُ ـ فَأَتَاهُمْ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مِنْ مَّوَاعِظِهِ وَحِكَمِهِ مَا أَبْطَلَ بِهِ قَوْلَهُمْ وَأَثْبَتَ بِهِ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ.

فرزند رسولؐ! اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ عطا کیا، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو طِب کا اور حضرت محمّد بن عبداللہ صلّی اللہ علیہ وَآلہٖ وسلم کو زبان و بیان اور خطابت کا؟

امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا، اس زمانے میں چہار طرف جادو کا چرچا تھا اِس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ بات عطا کی جو جادوگروں کے بس سے باہر تھی، جس نے ان کے جادو کو خاک میں رلا دیا اور ان پر حجّت قائم کردی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت مبعوث ہوئے جب بیماریاں اور جسمانی نقائص عام تھے اور لوگوں کو عِلاج مُعالجہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ نے انھیں وہ چیز عطا کی جس سے اس زمانے کے اطبّاء عاجز تھے۔ انھوں نے اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کیا، اندھوں اور مبروصوں کو صحّت یاب کیا اور اس طرح اہل زمانہ پر حجّت قائم کردی۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اس زمانے میں عرب میں خطابت اور شعر و سخن کا دور دورہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اللہ کی طرف سے ایسے مواعظ پیش کیے کہ اہلِ عرب دنگ رہ گئے، ان کی فصاحت و بلاغت کا بازار سرد پڑ گیا اور اس طرح اُن پر حُجّت

قائم کردی[1]

قرآنِ کریم کے علاوہ آنحضرتؐ کے اور بھی معجزات تھے۔ جیسے شق القمر، سانپ کا باتیں کرنا اور کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، لیکن قرآن کے معجزہ کی شان ان سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کا استدلال زیادہ قوی ہے، کیونکہ عرب جو علومِ طبیعیہ سے ناواقف اور تخلیق کے اسرار و رموز سے ناآشنا تھے، وہ ان دوسرے معجزات میں شک کر سکتے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ اپنی جہالت کے باعث ان کا سبب کچھ غلط سلط سمجھ بیٹھیں لیکن قرآن کے اعجاز اور اس کی بلاغت میں ان کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کیونکہ بلاغت ان کا اپنا فن تھا اور وہ اس کے رموز سے بخوبی آگاہ تھے علاوہ ازیں دوسرے معجزات محض وقتی تھے اور ان کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ چند ہی روز بعد ان کی حیثیت ایسی کہانی کی سی رہ جاتی جو اگلے، پچھلوں سے روایت کرتے ہیں اور پھر شک کا دروازہ کھل جاتا۔ قرآن البتہ ایک ایسا معجزہ ہے جو ابد تک باقی رہے گا۔ اس کا اعجاز دائمی ہے اور چاہے کتنی ہی نسلیں گزر جائیں اس کی رونق اور چمک دمک میں فرق نہیں آسکتا۔

قرآن معجزۂ الٰہی ہے

ہر باشعور شخص کو جس تک اسلام کی دعوت پہنچی ہے،

---

[1] اصول الکافی جلد ا کتابُ العقل والجہل۔ حدیث ۲۰۔

معلوم ہے کہ رسول اکرمؐ نے دنیا کی تمام قوموں کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن کو ان کے سامنے بطور دلیل پیش کیا۔ انھوں نے قرآن کے اعجاز کا دعویٰ کیا اور سب قوموں کو للکارا کہ اگر ہو سکے تو اس کی نظیر پیش کریں بلکہ اگر ضرورت سمجھیں تو سب مل کر اجتماعی کوشش بھی کر دیکھیں۔ پھر آپؐ نے اپنے مطالبے میں تخفیف کر کے کہا کہ زیادہ نہیں تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لائیں۔ اس کے بعد آپؐ نے مزید تخفیف کر کے کہا، "اچھا ایک ہی سورت بنا کر لائیں۔"

عربوں کو تو اپنی زبان آوری پر ناز تھا، اگر اس جیسا کلام پیش کرنا ناممکن نہیں تھا تو انھیں چاہیے تھا کہ قرآن کی کسی ایک ہی سورت کا مقابلہ کرتے اور فصاحت و بلاغت میں اس کی نظیر پیش کر دیتے۔ انھیں ایک ایسے فن میں مقابلے کی دعوت دی گئی تھی جس میں وہ کمال کے دعویدار تھے اور وہ ان کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ اس طرح ان کی کامیابی کے جھنڈے گڑ جاتے اور اس معمولی مقابلے کے بعد انھیں زہرہ گداز جنگیں لڑنے، مال و دولت خرچ کرنے، گھر سے بے گھر ہونے اور مصائب و آلام برداشت کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔

جب عربوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت پر غور کیا تو ان کے سر اس کی عظمت کے سامنے جھک گئے اور وہ سمجھ گئے کہ اگر انھوں نے مقابلے کی کوشش کی تو وہ اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے سامنے ہار مان لی۔ پھر ان میں سے

بہت سے تو مشرف بہ اسلام ہوگئے اور کچھ دوسروں نے ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کیا اور الفاظ کی بجائے تلوار سے مقابلے کی ٹھانی۔ گویا کہ انشا پردازی کی بجائے تیر اندازی کو بہتر سمجھا، ان کا زبان و بیان کے مقابلے سے گریز خود اس بات کی واضح دلیل تھا کہ قرآن وحیِ الٰہی ہے اور یہ انسان کے بس کا کام نہیں۔

ممکن ہے کوئی ناواقف غیر مسلم یہ کہے کہ ہوسکتا ہے عربوں نے رسول اکرمؐ کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے قرآن کی نظیر پیش کی ہو۔ لیکن طویل مدّت گزر جانے کے باعث اب اس کی کیفیت نظروں سے اوجھل ہو چکی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب واقعی مقابلہ کرتے تو اپنی مجالس میں ضرور اس کا اعلان کرتے، اپنے اجتماعات اور میلوں ٹھیلوں میں اس کی مشتہری کرتے اور پھر دشمنانِ اسلام ضرور اسے لے اُڑتے۔ پھر وہ ہر محفل میں اور ہر موقع پر اس کے گیت گاتے، اپنے بعد آنے والوں کو اس واقعہ کی خبر دیتے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ہر وہ جتن کرتے جو کوئی مدّعی اپنے دعوے کی دلیل کو محفوظ رکھنے کے لیے کرسکتا ہے۔ یہ کام ان کے لیے اسلاف کی تاریخ اور ایامِ جاہلیت کے اشعار محفوظ رکھنے سے زیادہ دِل خوش کُن ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ قدیم حکایات اور جاہلی اشعار سے تو تاریخی کتابیں اور دیوان بھرے پڑے ہیں لیکن قرآن سے مقابلے کا واقعہ نہ کہیں دیکھنے میں آیا نہ سُننے میں۔ حالانکہ قرآن کریم نے ساری دنیا کو مقابلے کی دعوت دی تھی۔ بلکہ انسانوں اور جنّوں سب کو للکارا تھا اور اس کی تحدّی کسی خاص جماعت سے مخصوص

نہیں تھی۔ جیساکہ اللہ جلّ شانہ، نے فرمایا ہے :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا .

کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنّات جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں، جب بھی وہ نہ لا سکیں گے خواہ وہ ایک دُوسرے کی مدد بھی کریں۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۸)

ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی اور دیگر دشمنانِ اسلام اس دین کی عظمت کو نقصان پہنچانے اور اس کے نبیِّ اعظمؐ اور اس کی کتابِ مقدّس پر کیچڑ اچھالنے کے لیے بے تحاشا دولت خرچ کرتے ہیں اور ہر سال بلکہ ہر ماہ اپنے اس قبیح فعل کو دُہراتے رہتے ہیں۔ اب اگر قرآن کا مقابلہ ممکن ہوتا اور اس جیسی ایک سُورت بھی بنائی جا سکتی تو اس سے بڑھ کر اسلام کے خلاف کیا دلیل ہو سکتی تھی اور ان کی دِلی آرزوؤں کے بر آنے کی اس سے بہتر کیا سبیل ہو سکتی تھی؟ پھر نہ انھیں اتنی دولت خرچ کرنے کی ضرورت رہتی اور نہ اتنی تکلیف اٹھانے کی حاجت۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ .

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نُور کو پھُونک مار کر بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو ضرور کمال تک پہنچائے گا، گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۔ (سورۂ صف۔ آیت ۸)

عام مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فصیح و بلیغ کلام کو سامنے رکھ کر ایک عرصہ تک اس کی نقل اُتارنے کی مشق کرتا ہے تو وہ کم و بیش اس کے اُسلوب کی نقل پر قادر ہو سکتا ہے لیکن قرآن کے سلسلے میں یہ اُصول دُرست نہیں۔ قرآن کے اُسلوب کی نقل نہ تھوڑی ہو سکتی ہے نہ بہت۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا اُسلوب ایسا ہے جس کا سیکھنے سکھانے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر قرآن رسول اللہ ؑ کی اپنی تصنیف ہوتا تو اس کے طرز اور اُسلوب کا کچھ نہ کچھ اثر آپؐ کے خطبات اور اقوال میں بھی نمایاں ہوتا مگر حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کے خطبات اور آپؐ کے اقوال کا ایک خاص انداز ہے جو قرآن کے اُسلوب سے یکسر مختلف ہے۔ اگر آپؐ کے کچھ اقوال ایسے ہوتے جن میں قرآن سے مشابہت پائی جاتی تو وہ ضرور کہیں نہ کہیں نقل ہوتے۔ خصوصاً وہ دشمن جو ہر طرح اسلام کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے وہ تو ضرور ان کو لے اُڑتے۔

اس کے علاوہ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی بھی کچھ معیّن حُدود ہوتی ہیں جن کے دائرہ میں ہر انشا پرداز اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے قادر الکلام شاعروں اور نثر نگاروں کی فصاحت و بلاغت ایک یا دو یا تین اصنافِ سخن سے مخصوص ہوتی ہے۔ مثلاً بعض شعراء کے رزمیہ اشعار نہایت بلند ہیں لیکن وہ مدحیہ قصیدہ نہیں کہہ سکتے یا مثلاً مرثیہ گو شعراء عشقیہ اشعار میں پھسڈّی رہ جاتے ہیں لیکن قرآن کی بات ہی الگ ہے۔ قرآن متعدد اقسام کے موضوعات پر حاوی ہے اور اس میں اکثر

اصنافِ کلام سے تعرّض کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ طرزِ بیان ایسا ہے کہ کسی اور کی مجال نہیں کہ اس کی بلندی تک پہنچ سکے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو عادۃً کسی بشر کے لیے ممکن نہیں۔

قرآن لازوال معجزہ ہے

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ نبوّت کی تصدیق کرنے اور اس پر ایمان لانے کا واحد ذریعہ وہ معجزہ ہے جو نبی اپنے دعوے کے ثبوت میں دکھلاتا ہے۔ چونکہ انبیائے سابقین کی نبوّت ان کے اپنے زمانے اور ایک خاص نسل تک محدود تھی اِس لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہُوا کہ ان کے معجزات بھی ایسے ہوں جو تھوڑی مدّت کے لیے ہوں اور ان کا اثر بھی محدود ہو کیونکہ وہ محدود نبوّت کی نشانی تھے۔ چنانچہ صِرف ان کے اپنے زمانے کے کچھ لوگ یہ معجزات دیکھتے تھے اور ان پر حجّت قائم ہو جاتی تھی۔ کچھ اور لوگ ان دیکھنے والوں سے ان کا تذکرہ سنتے تھے اور اس طرح یہ ان کے لیے بھی حُجّت بن جاتے تھے۔

لیکن وہ شریعت جو اَبَد تک کے لیے آئی ہے اس کی تصدیق کے لیے معجزہ بھی اَبَدی اور لازوال ہونا چاہیے کیونکہ اگر معجزہ قلیلُ المدّت ہو تو بعد میں آنے والے لوگ اسے دیکھ نہیں سکیں گے اور مُرورِ زمانہ سے اس کی خبر میں تواتُر بھی باقی نہیں رہے گا۔ اِس لیے مدّتوں بعد آنے والوں کو نبوّت کی صداقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اِس صورت میں اگر مستقبلِ بعید میں آنے والوں کو بھی اس نبوّت پر

ایمان لانے کا مکلّف ٹھہرایا جائے تو یہ ایک ناممکن بات کو لازم ٹھہرانے کے مترادف ہوگا، یہ ایک امر محال ہے اور اللہ ایسا کبھی نہیں کرتا، اس لیے دائمی نبوّت کا معجزہ بھی دائمی ہی ہونا چاہیے، یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا جو دائمی اور لازوال نبوت کی دلیل ہے اور جو اگلوں کے لیے بھی اسی طرح حجّت ہے جیسے پچھلوں کے لیے۔

اس بحث سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں :-

پہلا تو یہ کہ قرآن کو انبیائے سابقین کے تمام معجزات اور خود رسولِ اکرمؐ کے دوسرے معجزات پر فوقیت اور برتری حاصل ہے کیونکہ قرآن کا اعجاز دائمی ہے اور یہ اَبدُالآباد تک باقی رہنے والا واحد معجزہ ہے جو مستقبل میں آنے والی تمام نسلوں کے لیے رہتی دُنیا تک حجّت ہے۔

دُوسرا یہ کہ سابقہ شریعتیں عارضی تھیں جو ختم ہوگئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی صداقت کو ثابت کرنے والے معجزے کا وقت ختم ہوچکا۔[1]

اس کے علاوہ قرآن کی ایک اور امتیازی خصوصیت کہ جس کی وجہ سے اسے انبیائے سابقین کے تمام معجزات پر برتری حاصل ہے یہ ہے کہ قرآن انسان کی ہدایت کا ضامن اور اسے اَوجِ کمال تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔[2] قرآن وہ رہنما ہے جس نے عَرَب جیسی وحشی اور سفّاک قوم کو جو بدترین عادات میں مبتلا تھی، بُت پرستی

---

[1] صفحہ ۱۹۷ پر ضمیمہ (الف) ملاحظہ کیجیے۔ [2] صفحہ ۲۰۰ پر ضمیمہ (ب) ملاحظہ کیجیے۔

جس کا شیوہ تھا، جو علم و تہذیب سے عاری تھی اور آپس میں لڑنا اور لاف زنی جس کا مشغلہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ایک ایسی قوم میں بدل دیا جو علوم و معارف میں سند، تاریخی عظمت سے بہرہ ور اور اعلیٰ اخلاق کی مالک بن گئی۔ ہر اُس شخص پر اسلام کی عظمت اور اثر آفرینی آشکارا ہو جاتی ہے جو اسلام کی تاریخ اور ان صحابۂ کرام کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے جنھوں نے رسول اللہؐ کی ہمراہی میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ قرآن ہی نے ان لوگوں کو جاہلیت کی پستی سے نکال کر علم و کمال کے ان اعلیٰ مراتب تک پہنچایا کہ اعلائے دین اور احیائے شریعت کی خاطر انھیں اپنی جان کی پروا رہی نہ اپنے مال و منال اور ازواج و اولاد کو چھوڑنے کا کوئی غم۔

مقدادؓ نے رسولِ خداؐ سے اس وقت جو کچھ عرض کیا تھا جب آپؐ غزوۂ بدر کے لیے روانگی کے وقت مسلمانوں سے مشورہ کر رہے تھے وہ ہماری اس بات کی تائید کے لیے کافی ہے :-

انھوں نے کہا تھا :

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ امْضِ لِمَا اَمَرَکَ اللّٰہُ فَنَحْنُ مَعَکَ وَاللّٰہِ لَا نَقُوْلُ کَمَا قَالَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ لِمُوْسٰی اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ، وَلٰکِنِ اذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا مَعَکُمَا مُقَاتِلُوْنَ فَوَالَّذِیْ بَعَثَکَ بِالْحَقِّ لَوْ سِرْتَ بِنَا لَجَادَلْنَا مَعَکَ مِنْ دُوْنِهٖ حَتّٰی تَبْلُغَهٗ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ خَیْرًا، وَدَعَا لَهٗ بِخَیْرٍ .

یا رسول اللہ ص! جس کام کے لیے اللہ نے آپ ص کو حکم دیا ہے، آپ ص اس کے لیے چلیے ہم آپ ص کے ساتھ ہیں بخدا ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جنھوں نے موسیٰ ع سے کہا تھا کہ "تم اور تمھارا خدا جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ آپ ص اللہ توکلی جنگ شروع کریں ہم بھی آپ ص کے ساتھ مل کر لڑیں گے، اُس ذات کی قسم جس نے آپ ص کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، اگر آپ ص ہمیں سمندر پار کر کے حبشہ چلنے کو کہیں گے تب بھی ہم آپ ص کے ساتھ ہر معرکہ میں شریک رہیں گے، یہاں تک کہ آپ ص وہاں پہنچ جائیں۔

رسولُ اللہ ص نے مقداد کے جذبے کو سراہا اور ان کے لیے دُعا فرمائی[1]

یہ اہلِ اسلام میں سے ایک شخص کی مثال تھی۔ اس واقعہ سے ان کے راسخ عقیدے، محکم یقین اور حق کو زندہ کرنے اور شرک کو نابود کرنے کی سعی میں اپنی جان تک کی پروا نہ کرنے کے جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میں عقیدہ کی پختگی اور اخلاص کا یہی عالم تھا۔

قرآن ہی نے اِن بُت پرستوں کے قلوب کو جن کا محبوب مشغلہ آپس میں جنگ و جدال اور ایک دوسرے پر مُفاخرت تھا ایسا

---

[1] تاریخ الطبری، غزوۂ بدر جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ طبع دوم۔

منوّر کردیا کہ "یہ کفّار کے مقابلے میں سخت اور آپس میں نرم دل" اور اپنے ساتھیوں کے جاں نثار بن گئے۔ اسلام کی بدولت اسّی سال کے قلیل عرصے میں انھوں نے وہ فتوحات حاصل کیں جو دوسروں کو آٹھ سو سال میں بھی نصیب نہ ہوسکیں۔ جو شخص رسولِ اکرمؐ کے صحابہ اور انبیائے سابقین کے صحابہ کی زندگی کا موازنہ کریگا اس کو معلوم ہوجائے گا کہ اس تفاوت کا سبب ایک خُدائی راز ہے اور اس راز کا سرچشمہ وہ کتابِ الٰہی ہے جس نے مسلمانوں کو عقیدہ کی رفعت اور اُصولوں پر جماؤ کے ساتھ رُوح کی تابانی، قلب کی پاکیزگی اور ہدف کی مضبوطی بخشی۔

اگر ہم حضرت عیسٰیؑ کے حواریوں اور دوسرے انبیائے سابقینؑ کے اصحاب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس طرح آڑے وقت میں اپنے رہبر کا ساتھ چھوڑ دیا اور جب اپنے لیے خطرہ محسوس کیا تو اپنے انبیاء کو دشمنوں کے حوالے کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انبیاء اپنے دَور کے شیاطین کے مقابلے میں پیش رفت نہ کرسکے اور غاروں اور وادیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ یہ ایک اور خصوصیت ہے جس کی بنا پر قرآن کو باقی تمام معجزات پر برتری حاصل ہے۔

یہ تو معلوم ہوگیا کہ قرآن اپنی بلاغت اور اپنے اسلوب کے لحاظ سے معجزۂ خداوندی ہے۔ اب یہ بھی سمجھ لیں کہ قرآن کا اعجاز صرف اس بات میں مضمر نہیں کہ وہ ایک ایسا معجزۂ ربّانی ہے جو مختلف لحاظ سے پیغمبرِ اکرمؐ کی نبوّت کی، جن پر وہ نازل ہوا صداقت

کی دلیل ہے۔ مناسب ہوگا کہ مختصر طور پر بعض دُوسرے پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ قرآن اور حقائق و معارف

کتابُ اللہ کی متعدد آیات میں تصریح ہے کہ حضرت محمدؐ اُمّی تھے اور آپؐ نے کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ آپؐ نے یہ دعویٰ علی الاعلان اپنے کنبے اور قبیلے کے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا جن کے درمیان آپؐ پلے بڑھے تھے۔ کسی نے ان کے دعوے کی تردید نہیں کی جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آپؐ کا دعویٰ درست تھا۔ لیکن اُمّی ہونے کے باوجود آپؐ جو کتاب لائے وہ ایسے معارف پر مشتمل ہے کہ فلاسفہ کی عقلیں ششدر ہیں اور ظہورِ اسلام سے لے کر آج تک مشرق و مغرب کے مفکّرین حیرت سے انگشت بدنداں ہیں اور قرآن کے بارے میں ان کا یہ تحیّر تا قیامِ قیامت اسی طرح باقی رہے گا۔ قرآنی اعجاز کا یہ ایک زبردست پہلو ہے۔

چلیے تھوڑی دیر کے لیے ہم اس دعوے سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور مخالفین کے پاسِ خاطر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ اُمّی نہیں تھے اور انھوں نے علوم و فنون اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اگر ایسا بھی ہو تو کیا یہ ضروری نہیں کہ انھوں نے یہ علوم و فنون اپنے زمانہ ہی کے ان تعلیم یافتہ لوگوں سے سیکھے ہوں گے جن کے درمیان انھوں نے پرورش پائی تھی۔ ہمیں

معلوم ہے کہ جن لوگوں میں آپؐ پلے بڑھے وہ بُت پرست اور توہّم پرست تھے اور ان کے عقائد دیومالائی تھے۔ یہ ایسی بات ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ ان میں کچھ اہلِ کتاب ضرور تھے جو اپنے علوم، اپنی تاریخ اور احکامِ مذہب، عہدِ قدیم اور عہدِ جدید سے اخذ کرتے تھے جن کو وہ الہامی قرار دیتے اور انبیاء سے منسوب کرتے تھے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آنحضرتؐ نے یہ اقوال اور تعلیمات اپنے ان ہم عصر عالموں سے حاصل کیے ہیں تو آپ کے خیالات اور عقائد میں ان کتابوں کا عکس نظر آنا چاہیے، جو آپؐ کے علوم کا سرچشمہ تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ہر لحاظ سے توراۃ و انجیل سے مختلف ہے، اس میں جو حقائق ومعارف بیان کیے گئے ہیں ان کا دیومالائی توہّمات سے دُور کا بھی تعلّق نہیں، جن سے بائبل وغیرہ جو اس زمانے کی تعلیم کا سرچشمہ تھیں بھری پڑی تھیں۔

قرآنِ کریم نے بکثرت آیات میں اللہ جلّ شانہ، کی صفات بیان کی ہیں لیکن ہر جگہ اس کی صفاتِ کمالیہ کو اس طرح بیان کیا ہے جو اس کی شان کے مناسب ہے اور اس کو ہر نقص وعیب سے پاک قرار دیا ہے۔

نمونے حسبِ ذیل ہیں:۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ.

مسیحی کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے۔ سُبحان اللہ! دراصل آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے

اور سب اس کے محکوم ہیں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۶)

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ.

وہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ وہ جب کسی کام کی ٹھان لیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۷)

وَاِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ.

اور تمھارا معبود تو وہی یکتا خدا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑا رحمٰن و رحیم ہے۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۶۳)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلۡحَـىُّ الۡقَيُّوۡمُ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ.

اللہ ہی وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سارے عالم کا سنبھالنے والا ہے، اس کو اونگھ یا نیند نہیں آتی۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۵)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخۡفٰى عَلَيۡهِ شَىۡءٌ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ.

آسمان و زمین میں کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۵)

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔

وہ ایسا ہے کہ رحمِ مادر میں تمھاری شکل وصورت جیسی چاہتا ہے بنادیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۶)

ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ۔

لوگو! اللہ ہی تمھارا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے، لہذا اسی کی عبادت کرو۔ وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ (سورہ انعام۔ آیت ۱۰۲)

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔

اس کو تو کسی کی نگاہ نہیں دیکھ سکتی وہ سب کی نگاہوں کو دیکھتا ہے۔ وہ بڑا باریک بیں اور باخبر ہے۔

(سورۂ انعام۔ آیت ۱۰۳)

قُلِ اللّٰهُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ

کہہ دیجیے کہ اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر تم کہاں حق سے پھرے جاتے ہو۔

(سورۂ یونس۔ آیت ۳۴)

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۔

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو جنھیں تم دیکھتے ہو بغیر ستونوں کے کھڑا کر دیا۔ پھر عرش کی طرف متوجہ ہوا اور آفتاب و مہتاب کو کام میں لگا دیا کہ ہر ایک اپنے مقررہ وقت تک چلا کرتا ہے۔ وہی ہر کام کا انتظام کرتا ہے اور اس غرض سے کہ تم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا یقین کر لو۔ اپنی آیتیں صاف صاف بیان کرتا ہے۔ (سورۂ رعد۔ آیت ۲)

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی دُنیا اور آخرت میں حمد کے لائق ہے۔ اُسی کا حکم چلتا ہے اور تم سب اُسی کے پاس لوٹ جاؤ گے۔

(سورۂ قصص۔ آیت ۷۰)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۔

وہی ہے خدا جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ جاننے والا ہے پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا۔ وہی رحمٰن و رحیم ہے۔ (سورۂ حشر۔ آیت ۲۲)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ

السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ .

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں - وہ صاحب اقتدار ہے ، سب عیبوں سے پاک ہے ، پناہ دینے والا ، امن دینے والا اور نگہبانی کرنے والا ہے، وہ غالب ، مقتدر اور عظمت والا ہے - ان سب سے بالاتر ہے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھیراتے ہیں -

(سورۂ حشر - آیت ۲۳)

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ . وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ .

وہی اللہ ہے جو پیدا کرنے والا ہے ، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے ، شکل دینے والا ہے ، اس کے اچھے نام ہیں - آسمانوں اور زمین میں ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے ، وہ زبردست حکمت والا ہے -

(سورۂ حشر - آیت ۲۴)

اِس طرح قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کرتا ہے اور ایسے حقائق کا انکشاف کرتا ہے جو ذوقِ سلیم کے عین مطابق اور معقولیت پر مبنی ہیں - کیا کوئی امّی شخص جس نے جاہلانہ ماحول میں پرورش پائی ہو وہ ایسے معارفِ عالیہ بیان کرسکتا ہے ؟

قرآن نے انبیاء کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کی وہی خوبیاں

بیان کی ہیں جو پیغمبروں میں ہونی چاہئیں اور جو نبوّت کے تقدس کے مناسب حال ہیں اور مامور من اللہ کی پاکیزگی کے لیے لازم ہیں۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ.

یہ لوگ ایسے رسولؐ نبیِّ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جس کے متعلق وہ لوگ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بُری باتوں سے منع کرتا ہے۔ پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتا ہے اور گندی چیزوں کو حرام کہتا ہے۔

(سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ.

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

وہی تو ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انھی کی قوم میں سے ایک ایسا رسولؐ بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ

بیشک آپؐ کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ (سورۂ قلم - آیت ۳)

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔

بیشک آپؐ اخلاقِ حسنہ کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔

(سورۂ قلم - آیت ۴)

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔

بیشک اللہ نے آدمؑ کو، نوحؑ کو اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمران کو سارے جہان سے برگزیدہ کیا ہے۔

(سورۂ آل عمران - آیت ۳۳)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِىْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۔

جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ (سورۂ زخرف - آیت ۲۶)

اِلَّا الَّذِىْ فَطَرَنِىْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۔

مگر ہاں، جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری رہنمائی کرے گا۔ (سورۂ زخرف - آیت ۲۷)

وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۔

ہم نے اس طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے راز دکھلائے کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۷۵)

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

ہم نے (ابراہیمؑ کو) اسحاقؑ اور یعقوبؑ دیئے۔ ہر ایک کو ہم نے راہِ حق کی طرف ہدایت کی اور اس سے پہلے ہم نے نوحؑ کو صحیح راہ دکھائی تھی۔ انھیں ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہم نے داؤدؑ کو، سلیمانؑ کو، ایوبؑ کو، یوسفؑ کو، موسیٰؑ کو اور ہارونؑ کو صحیح راہ دکھلائی تھی اور اسی طرح ہم نیک کام کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زکریاؑ کو، یحییٰؑ کو، عیسیٰؑ کو اور الیاسؑ کو بھی راہِ ہدایت دکھلائی۔ یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ نیز اسماعیلؑ کو، الیسعؑ کو، یونسؑ کو اور لوطؑ کو بھی ہم نے ہی صحیح راہ دکھلائی۔ ان میں

سے ہر ایک کو ہم نے تمام دُنیا پر فضیلت دی اور صرف انھیں کو نہیں بلکہ ان کے باپ داداؤں، بیٹوں اور بھائیوں میں سے بھی بعض کو ہم نے منتخب کیا اور ان کو راہِ راست کی ہدایت کی۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۸۴ تا ۸۷)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا۔ ان دونوں نے کہا "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۱۵)

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْیَارِ۔

اسماعیلؑ، الیسعؑ اور ذوالکفلؑ کو بھی یاد کیجیے کہ وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔ (سورۂ ص۔ آیت ۴۸)

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْرَآءِیْلَ وَمِمَّنْ هَدَیْنَا وَاجْتَبَیْنَا اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِیًّا۔

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے خاص انعام فرمایا ہے،

منجملہ دیگر انبیاء کے آدمؑ کی نسل سے اور ان لوگوں کی
نسل سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار
کیا تھا اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی نسل سے اور اُن
لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور منتخب کیا۔
جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں
تو وہ زاروقطار روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے۔

(سورۂ مریمؑ۔ آیت ۵۸)

یہ ان آیات کے چند نمونے ہیں جو انبیاءؑ کی پاکیزگی اور تقدس
کے بارے میں کتابُ اللہ میں آئی ہیں، جن میں انبیاءؑ کا ذکرِ جمیل
ہے ان کے تقدّس اور پاکیزگی کا صحیح حال!

توریت اور **انجیل** میں بھی انبیاءؑ اور ان کے اوصاف
کا تذکرہ ہے لیکن ان کے کیا اوصاف بیان کیے گئے ہیں اور ان
بزرگوں کی کس طرح توہین کی گئی ہے، اس کی مندرجۂ ذیل مثالیں
ملاحظہ ہوں :-

۱ * کتاب پیدائش کے باب اوّل و دوم میں آدم و حوّا کا قصہ
اور ان کے جنّت سے نکلنے کا تذکرہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا
ہے کہ اللہ نے آدم کو سب درختوں کا پھل کھانے کی
اجازت دی تھی سوائے نیک اور بد کی پہچان کے پھل کے۔

"خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ
کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے،
لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی

نہ کھانا، کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا، تو مرا۔"
"اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔
..... آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔"
(اس کے بعد سانپ نے آکر آدم و حوّا کو نیک و بد کی پہچان کا درخت دکھلایا اور ان کو اس کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور کہا:)
"تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خُدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خُدا کی مانند نیک و بد جاننے والے بن جاؤ گے۔"
(جب آدم و حوّا نے اس درختِ معرفت کا پھل کھایا:)
"تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہُوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتّوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں اور انھوں نے خداوند خُدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سُنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خُداوند خُدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟
اس نے کہا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سُنی اور

مَیں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو
چھپایا۔
اس نے کہا: تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟
کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا؟ جس کی بابت
میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔"
(جب خُدا کو معلوم ہوا کہ آدم نے اس درخت کا پھل
کھالیا ہے تو اس نے کہا:)
"دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں
سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ
اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی
کچھ لے کر کھالے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے
خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا...
... اور باغ عدن کے مشرق کی طرف کرّوبیوں اور
چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی
کے درخت کی حفاظت کریں۔"
ایک اور جگہ پر توریت کہتی ہے:
اُسی پرانے سانپ کو ابلیس کہا جاتا ہے اور وہی
وہ شیطان ہے جو سب لوگوں کو ورغلاتا ہے۔
اب دیکھیے کہ وہ کتاب جسے آسمانی کہا جاتا ہے، کس طرح ذاتِ
باری تعالیٰ پر الزام لگاتی ہے کہ اس نے جھوٹ بولا، اس درخت کے
بارے میں آدم کو دھوکا دیا اور پھر اس خوف سے کہ وہ کہیں حاکمیت

میں اس کا مقابلہ نہ کرے، اس کو جنّت سے نکال دیا۔ اس کتاب میں خُدا کو ایسا جسم قرار دیا گیا ہے جو چلتا پھرتا ہے۔ جب آدم چھپ گیا تو خدا کو پتا نہ چلا کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اِس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اس کتاب میں شیطان کو خدا سے بڑھ کر آدم کا خیر خواہ ثابت کیا گیا ہے یعنی اسی ورغلانے والے شیطان نے آدم کو نصیحت کی، اسے جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لایا اور نیک و بد کی پہچان کا راستہ بتلایا[1]

۲ * اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ ابراہیمؑ نے غلط بیانی سے سارہ کو فرعون کے سامنے بہن ظاہر کیا اور اس بات کو چھپا لیا کہ سارہ اس کی بیوی ہے:

"فرعون کے امراء نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے محل پہنچا دی گئی اور اس نے اس کی وجہ سے ابراہیم پر احسان کیا اور بھیڑ بکریاں اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈیاں اور گدھیاں اور اونٹ اس کے پاس ہو گئے۔"

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ سارہ ابراہیم کی بہن نہیں، بیوی ہے۔ "تب فرعون نے ابراہیم کو بُلا کر اس سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ تو نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ یہ

---

[1] بائبل۔ پیدائش۔ باب ۱۲

"تیری بیوی ہے؟ ...... سو دیکھ تیری بیوی حاضر ہے، اس کو لے اور چلا جا"۔ [1]

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود ایسا کام کیا جس کی وجہ سے فرعون نے ان کی بیوی سارہ کو پکڑ کر محل میں داخل کرلیا۔ معاذ اللہ! حضرت ابراہیمؑ کی شان تو بہت بلند ہے، وہ کیسے ایسا کام کرسکتے تھے جبکہ ایک عام آدمی بھی ایسا نہیں کرسکتا۔

۳ * بائبل میں حضرت لُوطؑ اور ان کی بیٹیوں کا قصّہ یُوں لکھا ہے:

"پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور دُنیا پر کوئی مرد نہیں جو دُنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مَے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ دُوسرے روز یُوں ہُوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ آج رات بھی اس کو مَے پلائیں

---

[1] بائبل۔ پیدائش۔ باب ۱۲۔

اور تو بھی جاکر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے
باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات بھی انھوں
نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس
سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب
لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ سو لُوط کی دونوں بیٹیاں
اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی سے بیٹا ہُوا
اور اس نے اس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں
کا باپ ہے جو اَب تک موجود ہیں اور چھوٹی سے
بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمّی
رکھا۔ وہی بنو عمّون کا باپ ہے جو اب تک موجود
ہیں۔" [1]

یہ قصّہ موجودہ توریت نے حضرت لُوطؑ نبی اللّٰہ اور ان کی بیٹیوں سے منسوب کیا ہے۔ قارئین خود اپنی عقل سے رائے قائم کرکے اس پر جو چاہیں، تبصرہ کریں۔

۴ * بائبل میں یہ بھی ہے کہ

حضرت اسحاقؑ نے چاہا کہ اپنے بیٹے عیسو کو نبوّت کی برکت دیں لیکن حضرت یعقوبؑ نے انھیں دھوکا دے کر یہ ظاہر کیا میں ہی عیسو ہوں۔ یعقوبؑ نے اسحاقؑ کو کھانا اور شراب پیش کی جو انھوں نے کھالیا اور شراب پی لی۔ اس طرح دھوکا

---

[1] بائبل۔ پیدائش۔ باب ۱۹

دے کر اور بار بار جھوٹ بول کر یعقوبؑ نے خدا کی برکت حاصل کرلی۔ اسحاقؑ نے کہا :

"تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے جھکیں۔ جو تجھ پر لعنت کرے وہ خود لعنتی ہو اور جو تجھے دُعا دے وہ برکت پائے۔"

جب عیسو کو معلوم ہوا کہ اس کا بھائی نبوّت کی برکت اُچک کرلے گیا تو اس نے باپ سے کہا :

"مجھ کو بھی دُعا دے، اے میرے باپ! مجھے بھی دُعا دے۔ اس نے کہا تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا۔"

پھر عیسو نے کہا :

"کیا تو نے میرے لیے کوئی برکت نہیں رکھ چھوڑی ہے؟"

اسحاقؑ نے عیسو کو جواب دیا :

"دیکھ میں نے اسے تیرا سردار ٹھیرایا اور اس کے سب بھائیوں کو اس کے سپرد کیا کہ خادم ہوں اور اناج اور مَے اس کی پرورش کے لیے بنائی۔ اب اے میرے بیٹے تیرے لیے میں کیا کروں؟ ..... تب عیسو چلّا چلّا کر رو دیا۔" [1]

---

[1] بائبل۔ پیدائش۔ باب ۲۷

کیا دھوکے سے نبوّت اُچک لے جانے کی بات عقل میں آتی ہے؟ کیا حضرت یعقوبؑ نے اس طرح حضرت اسحاقؑ کے علاوہ خُدا کو بھی دھوکا نہیں دیا؟ اور خدا اس کے بعد بھی نبوّت اس کے اصل حقدار کو واپس نہ دلا سکا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سب لغو باتوں سے بہت بلند ہے۔ شاید یہ کہانی جس میں حضرت اسحاقؑ سے شراب نوشی منسوب کی گئی ہے، شراب ہی کے نشہ میں گھڑی گئی ہوگی۔

۵ * بائبل ہی میں ہے کہ یہوداہ بن یعقوب نے اپنے بیٹے عیر کی بیوی مسمات تمر کے ساتھ زنا کیا جس سے وہ حاملہ ہوگئی اور اس کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ فارص اور زارح۔ انجیل متی باب اول میں حضرت یسوع مسیحؑ کا شجرۂ نسب مفصّل مذکور ہے۔ اس میں مسیح، سلیمان اور ان کے باپ داؤد کو اسی فارص کی نسل سے بتایا گیا ہے جو یہوداہ کے اپنی بہو تمر کے ساتھ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا[۵۷]

مَعاذَ اللہ! انبیاءؑ بھی کہیں زنا کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کی پیدائش کو زنا سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ لیکن موجودہ توریت کے مصنف کو ذرا بھی پروا نہیں کہ وہ کیا کہتا اور کیا لکھتا ہے!

۶ * بائبل ہی میں ہے کہ داؤد نے اوریّا کی بیوی سے جو مُجاہد اور مؤمن تھا زنا کیا:

---

۵۷ بائبل - پیدائش - باب ۳۸

"شام کے وقت داؤد بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا۔ اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کہ وہ اوریّا کی بیوی ہے۔ داؤد نے لوگ بھیج کر اُسے بلا لیا۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ عورت حاملہ ہو گئی۔"

(اس پر داؤد بدنامی سے ڈرا اور اس نے اوریّا کو بیوقوف بنانا چاہا۔ اسے بلا کر کہا کہ اپنے گھر جا لیکن اوریّا نے انکار کیا اور کہا:)

"میرا مالک یوآب اور میرے مالک کے خادم میدان میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ تو کیا میں اپنے گھر جاؤں اور کھاؤں اور پیوں اور بیوی کے ساتھ سوؤں ؟ تیری حیات اور جان کی قسم! مجھ سے یہ بات نہ ہو گی۔"

(جب داؤد اوریّا سے نا امید ہو گیا تو اس نے اوریّا سے کہا:)

"آج بھی تو یہیں رہ جا۔ کل میں تجھے روانہ کروں گا سو اوریّا اس دن بھی اور دوسرے دن بھی یروشلم میں رہا اور جب داؤد نے اسے بلایا تو اس نے اس کے حضور کھانا کھایا اور اس نے اسے مے پلا کر

متوالا کیا ..... صبح کو داؤد نے یوآب کے لیے ایک
خط لکھا اور اسے اوریا کے ہاتھ بھیجا اور اس نے
خط میں یہ لکھا کہ اوریا کو گھمسان میں سب سے
آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ آنا تاکہ
وہ مارا جائے۔"

یوآب نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ اوریا مارا گیا۔ جب
داؤد کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اوریا کی بیوی کو
جب اس کے سوگ کے دن گزر گئے، بلوا کر اپنے
محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی۔[1]

انجیل متّی کے باب اوّل میں سلیمان کو اسی
بیوی سے داؤد کا بیٹا بتلایا گیا ہے۔

غور کیجیے کہ اس وضعی روایت کا مصنّف کس طرح اللہ کی
جناب میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ نبی کی شان تو بہت بلند
ہے۔ کیا ایسی بات کسی عام آدمی سے بھی منسوب کی جا سکتی ہے
جس میں ذرا بھی غیرت و حمیّت ہو؟ انجیل لوقا میں لکھا ہے کہ مسیح
اپنے باپ داؤد کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہ قصہ اس سے کہاں تک
مطابقت رکھتا ہے؟

۷ * ایک اور جگہ پر کہا گیا ہے:

"اور اس (سلیمان) کے پاس سات سَو شہزادیاں

---

[1] بائبل۔ سموئیل (۲)۔ باب ۱۱

اس کی بیویاں، اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا....... اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا اور اس کا دل خداوند خدا کے ساتھ کامل نہ رہا، جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا۔ کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمّونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا اور سلیمان نے خداوند خدا کے آگے بدی کی . . . . . . اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا: "میں سلطنت کو ضرور تجھ سے چھین کر تیرے خادم کو دوں گا"۔[1]

بائبل یہ بھی کہتی ہے:

"اور بادشاہ (یوسیاہ) نے ان اونچے مقاموں پر نجاست ڈلوائی جو یروشلم کے مقابل کوہِ آلائش کے داہنی طرف تھے جن کو اسرائیل کے بادشاہ سلیمان نے صیدانیوں کی دیوی عستارات اور موآبیوں کے نفرتی کموس اور بنی عمّون کے نفرتی ملکوم کے لیے بنایا تھا اور اس نے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یسیرتوں کو کاٹ ڈالا اور اس کی جگہ مُردوں کی ہڈیاں بھر دیں"۔[2]

---

[1] بائبل۔ سلاطین (۱)۔ باب ۱۱۔ [2] بائبل۔ سلاطین (۲)۔ باب ۲۳

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں حالانکہ عقلی دلائل سے نبی کی عصمت ثابت ہے، پھر بھی کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ کوئی نبی بتوں کو پُوجے گا اور ان کے لیے اُونچے مقامات بنائے گا؟ کیا اس کے بعد بھی وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دے سکتا ہے اور اللہ کی عبادت کے لیے کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

۸ * "جب خداوند نے ہوسیع کی معرفت کلام کیا تو اس کو فرمایا کہ جا ایک بدکار بیوی اور بدکاری کی اولاد اپنے لیے لے کیونکہ مُلک نے بڑی بدکاری کی ہے۔ پس اس نے جا کر جُمر بنت دِبلائم کو لیا۔ وہ حاملہ ہوئی اور بیٹا پیدا ہُوا ..... اور وہ پھر حاملہ ہوئی اور بیٹی پیدا ہوئی ..... اور وہ پھر حاملہ ہوئی اور بیٹا پیدا ہوا۔

"خداوند نے مجھے فرمایا جا اس عورت سے جو اپنے یار کی پیاری اور بدکار ہے، محبّت رکھ۔ جس طرح کہ خداوند بنی اسرائیل سے ...... محبّت رکھتا ہے۔" [۱]

کیا اللہ کے احکام یہی ہوتے ہیں؟ کیا وہ نبی کو زنا کرنے اور زانیہ عورت سے محبّت کرنے کو کہتا ہے؟ معاذ اللہ۔ اس میں تو کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ مصنّف کو اس کی قباحت کا احساس

---

[۱] بائبل۔ ہوسیع۔ باب ۱-۳

نہیں ہوا لیکن تعجّب تو اس پر ہے کہ مہذّب قومیں اور عصرِ حاضر کے افراد اور علماء جو توریت کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں درج خرافات سے بخوبی واقف ہیں، وہ کیسے یہ یقین کرتے ہیں کہ یہ وحیِ الٰہی اور آسمانی کتاب ہے! بات یہ ہے کہ تقلیدِ آباء طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے، اُسے چھوڑ کر حق و حقیقت کا اتباع دشوار ہے، صرف اللہ ہی ہدایت دے سکتا ہے!

۹ * انجیل متی کے بارھویں باب میں — انجیل مرقس کے تیسرے باب میں — اور انجیل لوقا کے آٹھویں باب میں ہے:

"جب وہ (یسوع مسیح) بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا، اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا: دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا: کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو! میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں، کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پہ چلے وہی میرا بھائی، میری بہن اور میری ماں ہے۔"

اِس کلام کو دیکھیے اور اس کی نامعقولیت پر غور کیجیے! مسیحؑ اپنی مقدّس ماں کو ڈانٹتے اور ان کی توہین کرتے ہیں اور ان پر اپنے شاگردوں کو ترجیح دیتے ہیں، جن کے متعلق خود مسیحؑ نے کہا تھا کہ

"وہ ایمان نہیں رکھتے"۔ جیسا کہ مرقس باب چہارم میں ہے ۔ "اور ان میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں"۔ جیسا کہ متی باب ۷ ا میں ہے ۔ اور جن سے حملہ والی رات کو مسیحؑ نے کہا تھا "تم یہاں ٹھیرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو"۔ لیکن انھوں نے نہ مانا اور جب علی الظاہر یہودیوں نے مسیح کو پکڑ لیا "اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے"۔ جیسا کہ انجیل متی باب ۲۶ میں ہے ۔ اناجیل میں اور بھی شاگردوں کی غلط کاریاں بیان کی گئی ہیں۔

۱۰ * یوحنا باب دوم میں ہے کہ

"یسوع مسیح ایک شادی میں شریک تھا جب وہاں شراب ختم ہوگئی تو اس نے پتھر کے چھ مٹکے معجزہ کے ذریعے شراب سے بھر دیے"۔

انجیل متی کے گیارہویں ۔ اور لوقا کے ساتویں باب میں ہے کہ "مسیح شراب پیتا تھا بلکہ بلانوش تھا"۔ مَعاذ اللہ! یہ حضرت مسیحؑ پر بہتان عظیم ہے۔

"خدا نے ہارون سے کہا کہ شراب اور نشہ، تُو اور تیرے بیٹے استعمال نہ کریں جب تم خیمۂ اجتماع میں داخل ہو۔ یہ ہمیشہ کے لیے تمھاری نسلوں کے لیے ضروری ہے تاکہ مقدس اور غیر مقدس اور پاک اور ناپاک میں تمیز کر سکو"۔ [1]

---

[1] بائبل ۔ احبار ۔ باب ۲ ۔

لوقا باب اول میں یوحنا بپتسمہ دینے والے کی مدح میں ہے:

"وہ خُداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے اور نہ کوئی اور شراب پیئے گا۔"

اِس کے علاوہ عہدنامۂ قدیم اور عہدنامۂ جدید میں اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے شراب کی حرمت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ چند چھوٹی مثالیں ہیں اُن رکیک، گمراہ کُن اور باطل باتوں کی جو عہدنامۂ قدیم اور عہدنامۂ جدید میں پائی جاتی ہیں اور جن کا دلیل و بُرہان سے کوئی تعلّق نہیں ہے اور جو عقلِ سلیم کے منافی ہیں۔ ہم نے ان کو قارئین کے سامنے اس لیے پیش کیا ہے کہ وہ ان پر غور کریں اور اپنی عقل و وجدان کے مطابق فیصلہ کریں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآنی تعلیمات اور مضامین، اِس قسم کی خرافات سے اخذ کیے ہوں، جب کہ قرآنی تعلیمات کی بلندی، پاکیزگی اور پختگی اظہر من الشمس ہے۔ کیا ان کتابوں کو وحیِ آسمانی سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ ان میں انبیاءؑ کے تقدس کو ان لغویات سے ملوث کیا گیا ہے جن میں سے چند ایک کا ہم نے بطور مشتے از خروارے تذکرہ کیا ہے [1]

---

[1] ان خرافات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الھدیٰ الی دین المصطفیٰ والرحلۃ المدرسیہ۔ از شیخ بلاغی قدس سرّہٗ۔

۲۔ قرآن کے مضامین کی ہم آہنگی

ہر سمجھدار اور تجربہ کار انسان یہ بات جانتا ہے کہ جو شخص قوانین وضوابط اور حوادث وواقعات کے بیان میں جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیتا ہے وہ یقیناً تناقض اور تضاد کا شکار ہوجاتا ہے، خصوصاً اگر وہ قانون، عمرانیات، عقائد اور اخلاق کے دقیق مسائل بیان کرتا ہو۔ پھر اگر وہ اپنا یہ عمل ایک طویل عرصے تک جاری رکھے تو اس کی باتوں میں واضح اختلاف نظر آئے گا۔ جیساکہ ایک مثل بھی مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔

تاہم قرآن کریم کہ جس نے مختلف اُمور سے مفصّل بحث کی ہے مثلاً الٰہیات، نبوّت، بنیادی احکام، سیاست مُدن، معاشرتی نظام اور اصولِ اخلاق وغیرہ سب اس کی بحث کے دائرۂ کار میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں کئی دُوسرے اُمور اور ان سے متعلق مَسائل کا بھی تذکرہ ہے، جیسے فلکیات، تاریخ، جنگ و صلح کے اُصول، موجوداتِ آسمانی اور زمینی مثلاً فرشتے، ستارے ہَوائیں، سمندر، نباتات، حیوانات اور انسان وغیرہ۔ نیز قرآن میں کئی ایک تمثیلیں بیان کی گئی ہیں اور قیامت کے ہولناک دن کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے، لیکن ان طرح طرح کے موضوعات کے باوجود کسی آیت میں ادنیٰ تناقض یا اختلاف نہیں اور کہیں بھی ان اُصولوں سے ہٹ کر بات نہیں کہی گئی جو عقل اور عُقلاء کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اکثر ایک ہی واقعہ کو دو یا دو سے زیادہ بار

دُہرایا گیا ہے مگر کہیں تعارض کا نشان نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا قصّہ قرآن میں بار بار آیا ہے اور ہر جگہ نئے انداز سے مگر اصل مضمون میں کوئی تفاوت نہیں۔

اگر آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ قرآن کی آیات متفرق طور پر وقتاً فوقتاً نازل ہوئی ہیں تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ قرآن واقعی وحیِ الٰہی ہے۔ اس لیے کہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ جمع کیے جانے کے بعد تناسب اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں حالتوں میں قرآن کا اعجاز اپنی جگہ برقرار ہے۔ جب متفرق طور پر نازل ہُوا تھا تب بھی معجزہ تھا اور جب جمع ہو گیا تو اعجاز کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو گئی۔ اس اعجاز کی طرف اللہ کے اس قول میں اشارہ ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے کہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت ہوتا۔

(سورۂ نساء - آیت ۸۲)

اِس آیت میں وہ اصول بیان کیا گیا ہے جس کا فطری طور پر سب کو احساس ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ جو شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہو گا اس کے قول میں تفاوت اور بیان میں تناقض لازمی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو کلام اللہ میں قطعاً نہیں پائی جاتی۔

قرآن کا طرزِ استدلال عموماً یہی ہے کہ وہ انسانی فطرت کی طرف توجّہ دلاتا ہے۔ یہی رہنمائی کا کامیاب ترین طریقہ اور ہدایت کا آسان راستہ ہے۔ خود عربوں نے بھی قرآن کے مضامین میں ہم آہنگی کا احساس کرلیا تھا اور فُصحائے عرب کو اس کا پُختہ یقین تھا۔ اس کی وضاحت ولید بن مغیرہ کے اس جواب سے ہوتی ہے جو اس نے اس وقت دیا تھا، جب ابوجہل نے قرآن کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تھی :۔

"میں اس کے بارے میں کیا کہوں ! بخدا تم میں سے کوئی بھی اشعار، رجز اور قصیدے کے رُموز نیز جنّات سے منسوب اشعار کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن بخُدا ان میں سے کوئی چیز قرآن کی برابری نہیں کرسکتی۔ قرآن میں کچھ اور ہی شیرینی ہے۔ یہ ہر دوسرے کلام کو پاش پاش کردیتا ہے، یہ سب پر غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔"

ابوجہل نے کہا :

"بخدا ! تمھاری قوم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگی جب تک تم اس کا کوئی نقص بیان نہیں کروگے۔"

ولید نے کہا :

"اچھّا مجھے سوچنے دو۔" پھر سوچ کر کہا : "قرآن جادو ہے جسے محمّدؐ نے جادوگروں سے لیا ہے۔"

(تفسیر الطبری جلد ۲۹ صفحہ ۹۸)

ایک اور روایت کے مطابق ولید نے کہا :

"بخدا میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سُنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے نہ جنّات کے۔ اس میں شیرینی اور تابانی ہے، یہ بظاہر بارور ہے اور بہ باطن فراوان۔ یہ سب پر غالب ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔"

(تفسیر القرطبی جلد ۱۹ صفحہ ۷۲)

اگر آپ قرآن کے اعجاز کو محسوس کرنا چاہیں تو ذرا ان دوسری کتابوں پر نظر ڈالیں جن کو الہامی کہا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے مطالب میں تناقض اور طرزِ بیان میں ہم آہنگی کا فقدان ہے اگر آپ عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید کو دیکھیں اور ان میں پائے جانے والے تضاد پر غور کریں تو حقیقت کھل جائے گی اور جھوٹ سچ کا فرق واضح ہو جائے گا۔ اناجیل کی اختلاف بیانی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

۱۔ انجیل متّی کے بارھویں اور انجیل لوقا کے گیارھویں باب میں حضرت مسیحؑ کا قول ہے :-

"جو میری طرف نہیں وہ میرے خلاف ہے اور جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے۔"

لیکن اس کے برخلاف انجیل مرقس کے نویں اور لوقا کے بھی نویں باب میں ہے کہ

"جو ہمارے خلاف نہیں وہ ہماری طرف ہے۔"

۲ ـ انجیل متّی کے انیسویں، مرقس کے دسویں اور لُوقا کے اٹھارویں باب میں ہے کہ ایک شخص نے یسوع سے کہا :

"اے نیک اُستاد!"

یسوع نے اس سے کہا "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا۔"

یوحنّا کے دسویں باب میں ہے کہ یسوع نے کہا :

"میں نیک چرواہا ہوں۔"

۳ ـ متّی کے باب ۲۷ میں ہے کہ "وہ دو ڈاکو جو مسیح کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے اس پر لعن طعن کرتے تھے۔"

اور لُوقا باب ۲۳ میں ہے :

"پھر جو بدکار صلیب پر لٹکائے گئے، ان میں سے ایک طعنہ دینے لگا کہ کیا تو مسیح نہیں؟ تو اپنے آپ کو اور ہمیں بچا۔ مگر دوسرے نے اسے جھڑک کر جواب دیا۔ کیا تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا حالانکہ اس سزا میں گرفتار ہے! ہماری سزا تو واجبی ہے کیونکہ اپنے کاموں کا بدلہ پا رہے ہیں، لیکن اس نے تو کوئی بے جا کام نہیں کیا۔"

۴ ـ انجیل یوحنّا باب پنجم میں ہے :

"اگر میں اپنی گواہی دوں تو میری گواہی سچّی نہیں۔"

اِسی انجیل کے آٹھویں باب میں ہے :

"اگرچہ میں اپنی گواہی آپ دیتا ہوں تو بھی میری
گواہی سچّی ہے"

یہ تھوڑا سا نمونہ ہے اناجیل کے تضادات کا، حالانکہ ان میں سے ہر ایک کا حجم چند صفحوں سے زیادہ نہیں ہے۔ تاہم ایک غیر متعصّب طالبِ حق کے لیے یہ نمونہ بھی کافی ہے[1]

۳۔ قرآن کا قانونی نظام

ماقبلِ اسلام کے عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس دَور کی قوموں پر کس قدر جہالت چھائی ہوئی تھی اور وہ علمی اور اخلاقی لحاظ سے کس قدر پستی کا شکار تھیں۔ ان کی زندگی وحشیانہ تھی، وہ ایک دوسرے پر چڑھائی کرتی رہتی تھیں۔ ان کے دلوں میں لوٹ مار کا شوق سمایا ہوا تھا اور وہ جنگ و جدل کی آگ بھڑکانے کی طرف اپنے قدم تیزی سے بڑھاتی تھیں۔ اب رہ گئے عرب کہ جن کو توہّم پرستی سے وافر حصّہ ملا تھا۔ نہ ان کا کوئی ایک دین تھا، نہ ان کے معاشرے کا کوئی مضبوط نظام تھا۔ بس ایک تقلیدِ آباء ہی تھی جو کبھی انھیں دائیں طرف لے جاتی تھی اور کبھی بائیں طرف۔ بلادِ عرب میں اکثریت بُت پرستوں کی تھی۔ ہر قبیلے اور خاندان کا الگ دیوتا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے

---

[1] بیشتر معلومات کے لیے مؤلف کی کتاب نفحات الإعجاز اور شیخ بلاغی قدس سرہٗ کی کتاب الھدی والرحلۃ المدرسیہ سے رجوع فرمائیے۔

اور یقین رکھتے تھے کہ بارگاہِ الٰہی میں وہی ان کا شفیع ہے۔ وہ بُتوں سے مُرادیں مانگتے اور پانسے پھینک کر ان سے فال لیتے تھے۔ جُوا کھیلنے پر وہ فخر کرتے تھے[1] ان میں سوتیلی ماں سے نکاح کا رواج بھی تھا[2] اس سے بھی زیادہ شرمناک بات لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم تھی[3]

یہ تھی زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حالت۔ جب نُورِ محمدیؐ چمکا اور مکہؔ میں اسلام کی روشنی پھیلی تو وہی عرب علم کی دولت سے مالامال اور مکارمِ اخلاق سے بہرہ ور ہو گئے۔ بُت پرستی کی جگہ توحید نے اور جہالت کی جگہ علم نے لے لی۔ رذائل اب فضائل میں بدل گئے۔ آپس کی پھوٹ اور مخالفت کی جگہ بھائی چارہ اور اتفاق و اتحاد کا دور دورہ ہو گیا۔ پوری قوم ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی کہ اس نے اطراف واکنافِ عالم میں اپنی سلطنت کو وسعت دیدی اور مشرق و مغرب میں تہذیب و تمدّن کے جھنڈے گاڑ دیے۔ فرانس کا ایک سابق وزیر "دوری" کہتا ہے :

"ظہورِ اسلام نے قبائلِ عَرب کو متحد کر کے ایک ایسی قوم بنا دیا جس کا مقصد ایک تھا۔ چنانچہ یہ ایک بڑی قوم نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنے اقتدار کو اسپین

---

[1] بلوغ الارب جلد ۳ صفحہ ۵۰۔

[2] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۵۲۔

[3] بلوغ الارب جلد ۳ صفحہ ۴۳۔ مطبوعہ مصر

میں دریائے ٹیگ سے لے کر ہندوستان میں دریائے
گنگا تک وسعت دے دی اور چہار دانگِ عالم میں
تہذیب و تمدّن کا پھریرا لہرا دیا جب کہ یورپ قرونِ
وُسطیٰ کے اندھیروں میں ڈوبا ہُوا تھا۔ یورپ بربر
وحشی اقوام کے حملوں کے باعث بربریت کے جو بادل
چھا گئے تھے وہ مسلمانوں کے طُفیل ہی چھَٹ سکے"[1]

یہ سب کچھ کتابُ اللہ کی تعلیمات کی بدولت ممکن ہوا جو تمام آسمانی صحیفوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور جو نظام اس نے پیش کیا ہے وہ عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآن نے افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ قرآن کے آغاز ہی میں انسان کی زبان سے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق اللہ تعالیٰ سے طلب کی گئی ہے :

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔
(اے اللہ!) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

(سورۂ فاتحہ۔ آیت ۶)

بہ لحاظِ الفاظ مختصر ہونے کے باوجود اِس جملہ کے معنیٰ بڑے وسیع اور دُور رس ہیں[2]

---

[1] محمد فرید وجدی۔ صفوۃ العرفان صفحہ ۱۱۹
[2] اس کی تفصیل "سورۂ فاتحہ کی تفسیر" میں دیکھی جا سکتی ہے جو جامعہ تعلیماتِ اسلامی نے شائع کی ہے۔

قرآن نے اپنی متعدد آیات میں عدل و اعتدال کی درمیانی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ.

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دیا کرو اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو انصاف سے کام لو۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۵۸)

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.

عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۸)

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى.

اور جب بات کیا کرو تو انصاف کو ملحوظ رکھا کرو گو کوئی شخص تمھارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

(سورۂ انعام۔ آیت ۱۵۲)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.

بے شک اللہ عدل و احسان اور ذوی القربیٰ کو کچھ دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت

قبول کرو۔ (سورہ نحل - آیت ۹۰)

قرآن نے عدل و اعتدال کا حکم دیا ہے اور اپنی تعلیمات میں راہ مستقیم اختیار کی ہے، اس نے متعدّد مقامات پر بخل سے پرہیز کی ہدایت کی ہے اور لوگوں کو اس کی برائیوں اور انجامِ بد سے آگاہ کیا ہے :-

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے کچھ دیا ہے اور وہ اس کو (راہِ خدا میں) خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ طریقہ ان کے لیے اچھا ہے بلکہ یہ ان کے لیے بُرا ہے کیونکہ جس مال کو خرچ کرنے میں وہ بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں پہنایا جائے گا۔ آسمانوں اور زمین کا حقیقی وارث اللہ ہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (سورۂ آل عمران - آیت ۱۸۰)

اس کے ساتھ ہی قرآن نے اسراف اور فضول خرچی کی بھی ممانعت کی ہے اور اس کے مفاسد پر روشنی ڈالی ہے :

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔

اِسراف مت کرو۔ اللہ یقیناً اِسراف کرنے والوں
کو ناپسند کرتا ہے۔ (سورۂ انعام - آیت ۱۴۱)

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ۔
بے شک فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں ۔
(سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۷)

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا
تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔
نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ لو اور نہ ہی
اسے بالکل کھلا چھوڑ دو ورنہ الزام خوردہ تہی دست
ہو کر بیٹھے رہو گے۔ (سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۹)

اسی طرح قرآن نے مصائب پر صبر کرنے اور تکلیف برداشت کرنے کا حکم دیا ہے۔ صابر کی تعریف کی ہے اور اس سے ثوابِ عظیم کا وعدہ کیا ہے :

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔
صبر کرنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ملے گا ۔
(سورۂ زمر - آیت ۱۰)

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۔
اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
(سورۂ آل عمران - آیت ۱۴۶)

لیکن دوسری طرف مظلوم کے بھی ہاتھ باندھ نہیں دیے اور اس کو ظالم کے مقابلے میں بے بس نہیں کر دیا۔ مظلوم کو اجازت

ہے کہ جس قدر ظلم اس پر ہوا ہے اس کی مناسبت سے ظالم سے بدلہ لے تاکہ فساد کی جڑ کٹ جائے اور انصاف کا بول بالا ہو:

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ.

جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۹۴)

مقتول کے ولی کو اختیار ہے کہ وہ (قتل عمد کے مرتکب) قاتل سے قصاص لے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطَانًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ.

جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قصاص لینے کا اختیار دیا ہے مگر وہ قتل کا بدلہ لینے میں (شریعت کی مقرر کردہ) حد سے تجاوز نہ کرے۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۳)

قرآن نے اعتدال کے راستے پر چلتے ہوئے عدل و استقامت کا حکم دے کر دنیاوی نظام کو آخرت کے نظام کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے ایسا نظام قائم کیا ہے جو دنیا و آخرت دونوں کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔ یہی وہ عظیم قانون ہے کہ جسے اسلام کے عظیم پیغمبرؐ بنی نوع انسان کے لیے لائے تاکہ انسان کو دین و دنیا کی بھلائی حاصل ہو سکے۔ موجودہ توریت کی طرح ان کا لایا ہوا قانون محض دُنیا کے لیے نہیں کہ جس میں آخرت کا کوئی خیال

نہیں رکھا گیا۔ توریت میں اس کی ضخامت کے باوجود قیامت اور معاد کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف یہی تصریح ہے کہ نیک اعمال سے دنیا میں دولت اور دوسروں پر حکومت ملتی ہے اور بُرے اعمال کے نتیجے میں آدمی خداوند کی نظروں میں گر جاتا ہے جس کا نتیجہ دولت و اقتدار کا زوال ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں ہے کہ قرآن کا قانون محض آخرت کے لیے ہو اور اسے دُنیاوی امور سے کوئی تعلق نہ ہو جیسا کہ موجودہ انجیل کی صورت ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی شریعت کامل اور مکمل ہے، اس کی نظر دُنیا کی بھلائی پر بھی ہے اور آخرت کی فلاح پر بھی۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ.

جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کریں گے، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کردے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ (سورہ نساء۔ آیت ۱۳)

وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ.

جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کے قوانین سے تجاوز کرے گا، اللہ اس کو آگ میں داخل کردے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو

ذلّت آمیز سزا ہوگی۔ (سورۂ نسار - آیت ۱۴)

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔

جو شخص ذرّہ بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو بھی دیکھ لے گا۔ (سورۂ زلزال - آیات ۷-۸)

وَابۡتَغِ فِيۡمَاۤ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ وَلَا تَنۡسَ نَصِيۡبَكَ مِنَ الدُّنۡيَا ۔

اللہ نے جو کچھ تمھیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کی بھی جستجو کرو اور دنیا میں بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کرو۔ (سورۂ قصص - آیت ۷۷)

قرآن اپنی آیات میں تحصیلِ علم اور تقویٰ سے وابستگی کی تاکید کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی لذّتوں اور نعمتوں سے تمتع اور انتفاع کی بھی اجازت دیتا ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ۔

(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ اللہ نے زینت کا سامان اور کھانے پینے کی جو پاکیزہ چیزیں پیدا کی ہیں۔ ان کو کس نے حرام قرار دیا ہے۔ (سورۂ اعراف - آیت ۳۲)

قرآن اکثر اللہ کی عبادت کی تلقین کرتا ہے اور اس کی نازل کی ہوئی تکوینی اور تشریعی آیات پر غور کرنے اور آفاق و انفس

میں تدبّر کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ صرف تعلّق مع اللہ کے ہی پہلو پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زندگی کے معاشرتی پہلو پر بھی زور دیتا ہے اور لوگوں کے باہمی تعلّقات سے بھی بحث کرتا ہے مثلاً اللہ نے خرید و فروخت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے :

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔

اللہ نے حلال کیا ہے خرید و فروخت کو اور حرام کیا ہے سُود کو ۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۷۵)

نیز معاہدوں کی پابندی کا حکم دیتے ہوئے کہا ہے :

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔

اے ایمان والو ! اپنے معاہدوں کو پورا کرو ۔

(سورۂ مائدہ - آیت ۱)

پھر نوعِ انسانی کی بقاء کے لیے قرآن نے نکاح کا حکم دیا ہے اور کہا ہے :

وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۔

تم میں سے جو بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دیا کرو اور اسی طرح اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا بھی کہ جو اس قابل ہوں ۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا ۔ اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے ۔ (سورۂ نور - آیت ۳۲)

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۔

جو عورتیں تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کر لو دو، تین یا چار سے۔ لیکن اگر تمھیں ڈر ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو۔

(سورۂ نسار - آیت ۳)

مرد کو بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اعزّاء و اقربار کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کے ساتھ بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ نیکی اور اچھے برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔

عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو۔

(سورۂ نسار - آیت ۱۹)

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔

عورتوں کے بھی مردوں پر حقوق ہیں جو مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو مردوں کے عورتوں پر ہیں، قاعدۂ شرعی کے مطابق۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۲۸)

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ

بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا.

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہلِ قرابت کے ساتھ بھی اور یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ بھی اور پاس والے اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور پہلو میں بیٹھنے والے مصاحبین کے ساتھ بھی، پردیسیوں کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمھارے مالکانہ قبضے میں ہیں۔ بے شک اللہ اکڑباز اور شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۂ نساء - آیت ۳۶)

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ.

جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے تم بھی اوروں کے ساتھ احسان کیا کرو اور دنیا میں فساد کے خواہاں مت بنو۔ (سورۂ قصص - آیت ۷۷)

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ.

بے شک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے۔ (سورۂ اعراف - آیت ۵۶)

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

نیکی کرو کہ خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۹۵)

یہ چند مثالیں ہیں قرآنی تعلیمات کی جن میں قرآن اعتدال کی راہ پر گامزن ہے۔ اُس نے امّت کے تمام افراد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے اور اس فریضہ کی انجام دہی کسی طبقہ یا خاص افراد سے مخصوص نہیں کی۔ یہ قانون بنا کر اس نے اپنی تعلیمات کے پھلنے پھولنے کے دروازے کھول دیے ہیں اور ان میں زندگی اور تسلسل کی رُوح پھونک دی ہے، خاندان اور معاشرے کے ہر فرد کو خاندان اور معاشرے کے ہادی اور نگران کا درجہ دیا گیا ہے بلکہ ہر مسلمان کو تمام مسلمانوں کے لیے رہنما اور نگران قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ دوسروں کو صحیح راستے پر چلائے اور انھیں معصیت اور فساد سے روکے۔ سب مسلمان احکام کی تبلیغ اور ان کو نافذ کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔ کیا اس سے زیادہ طاقت ور اور مؤثر کوئی لشکر ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ اپنے لشکر ہی کی طاقت سے اپنا حکم رعایا سے منواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے لشکری ہر وقت اور ہر جگہ رعایا کے ساتھ نہیں رہ سکتے لہذا اسلام کے لشکر اور بادشاہوں کے لشکر میں فرق واضح ہے۔

اسلام کی ایک اہم تعلیم آپس میں مسلمانوں کا اتّحاد و اتفاق اور بھائی چارہ ہے۔ اسلام میں سب مسلمان برابر ہیں، امتیاز کی بنیاد صرف علم و تقویٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرّم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ (سورۂ حجرات - آیت ۱۳)

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ .

(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ کیا اہلِ علم اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔ (سورۂ زمر - آیت ۹)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَعَزَّ بِالْاِسْلَامِ مَنْ كَانَ فِى الْجَاهِلِيَّةِ ذَلِيْلًا ، وَاَذْهَبَ بِالْاِسْلَامِ مَا كَانَ مِنْ نَخْوَةِ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَفَاخُرِهَا بِعَشَائِرِهَا وَبَاسِقِ اَنْسَابِهَا ، فَالنَّاسُ الْيَوْمَ كُلُّهُمْ اَبْيَضُهُمْ وَ اَسْوَدُهُمْ وَقُرَشِيُّهُمْ وَعَرَبِيُّهُمْ وَعَجَمِيُّهُمْ مِنْ اٰدَمَ . وَاِنَّ اٰدَمَ خَلَقَهُ اللّٰهُ مِنْ طِيْنٍ . وَ اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَطْوَعُهُمْ لَهٗ وَاَتْقَاهُمْ .

اللہ عزّوجل نے اسلام سے ان کو عزّت دی جو زمانۂ جاہلیت میں ذلیل تھے۔ اسلام نے جاہلیت کے غرور اور اپنے قبیلہ اور حسب و نسب پر فخر کو ختم کر دیا۔ آج سب لوگ گورے کالے، قریشی، عربی، عجمی اولادِ آدمؑ ہیں اور آدمؑ کو اللہ نے خاک سے پیدا کیا تھا۔ اللہ عزّوجلّ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے زیادہ

پسندیدہ وہ ہوگا جو سب سے زیادہ اللہ کا مطیع اور متقی ہوگا۔[1]

نیز آپؐ نے فرمایا:

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلٰی سَائِرِ النَّاسِ کَفَضْلِیْ اَدْنَاکُمْ۔

ایک عالم کو دوسروں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی مجھے تم میں سب سے ادنیٰ شخص پر۔[2]

اسلام نے سلمان فارسیؓ کو ان کے کمالِ ایمان کے سبب آگے بڑھا دیا یہاں تک کہ انھیں اہلبیتؑ میں شامل کر دیا اور ابولہب کو رسول اللہؐ کا چچا ہونے کے باوجود اس کے کفر کی وجہ سے پیچھے دھکیل دیا۔[3]

ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی قوم کے مقابلے میں اپنے حَسَب ونَسَب پر یا کسی اور چیز پر جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے اور کلمۂ توحید پڑھنے کی دعوت دی اور اتفاق اور یکجہتی کی تلقین کی۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسی قوم کو قابو میں کرلیا جس میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور دلوں میں نفاق بھرا ہوا تھا۔

---

[1] فروع الکافی جلد ۲ باب ۲۱ ان المؤمن کفوٌ المومنۃ۔

[2] الجامع الصغیر بشرح المناوی - جلد ۴ صفحہ ۴۳۲ -

[3] بحار الانوار جلد ۶ باب ۷۶ فضائل سلمانؓ -

آنحضرتؐ نے اس طرح ان کی طبیعت کو بدلا کہ تکبّر و نخوت کو بالکل ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ دولت مند شریف اپنی بیٹی ایسے غریب مسلمان سے بیاہنے لگے جو اس سے نَسَب میں کم تھا[1]

قرآن شریف فرد کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مفاد کا بھی خیال رکھتا ہے۔ اس نے ایسے قوانین پیش کیے ہیں جن سے دونوں کی ضرورت بطورِ احسن پوری ہوتی ہے۔ شریعت کے بعض قوانین کا تعلق دنیاوی امور سے ہے اور بعض کا آخرت سے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ہوشمند شخص اس شریعت کو لانے والی ہستی کی نبوّت میں شک کر سکتا ہے بالخصوص اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی پرورش ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جو ان تعلیمات سے یکسر ناآشنا تھا؟

۴۔ قرآن اور اس کے موضوعات کی پختگی

قرآنِ کریم نے گوناگوں موضوعات کی طرف توجّہ دی ہے۔ جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مثلاً الٰہیات و معارف مبدأ و معاد، مابعد الطبیعیاتی موجودات جیسے رُوح، فرشتہ، شیطان

---

[1] مثلاً زیاد بن لبید نے ــــ جو مدینہ کے اشرافِ بنی بیاضہ میں سے تھے ــــ اپنی بیٹی زلفاء کی شادی جویبر سے محض اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے کر دی تھی حالانکہ جویبر سیاہ فام، پستہ قد، بدصورت اور مفلس تھے۔

(فروع الکافی جلد ۲ باب ۲۱ ۔ ان المؤمن کفؤ المؤمنۃ)

اور جن۔ فلکیات، زمین، تاریخ، گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات۔ امثال، احتجاجات، اخلاقیات، عائلی حقوق، سیاستِ مُدن، معاشرتی نظام، جنگی قوانین، قضا و قدر، کسب و اختیار، عبادات و معاملات، نکاح و طلاق، میراث، حدود و قصاص وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام امور سے متعلق ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن میں نہ کوئی خامی ہے نہ اعتراض کی گنجائش اور نہ کسی غلط بات کی آمیزش۔

یہ بات عام طور پر کسی انسان کے بس کی نہیں کہ وہ کُلّی اور جُزوی ہر پہلو پر محیط ایسے قوانین وضع کرے جو ہر طرح بے عیب اور دائمی ہوں۔ پھر وہ انسان کہ جس نے ایسی جاہل قوم میں پرورش پائی ہو جس کا علوم و فنون میں قطعاً کوئی حصہ نہ رہا ہو، وہ اپنی عقل و فراست سے اس طرح کا نرالا کام کیسے انجام دے سکتا تھا۔ جبکہ ہم نظری علوم کے مصنّفین کو دیکھتے ہیں کہ کسی کتاب کی اشاعت سے تھوڑی ہی مدّت بعد اس کے مصنّف کی غلطیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں کیونکہ تحقیق جس قدر آگے بڑھتی ہے نئے نئے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور بعد میں آنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیشرو نے جو بات ثابت کی تھی وہ صحیح نہیں تھی اور بقول شخصے "حقیقت تحقیق کی بیٹی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ قدیم فلاسفہ اور ان کے متّبعین کے خیالات بعد میں نقد و نظر کا موضوع بن گئے اور ان پر تنقید کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ بہت سے نظریات جن کو پہلے قطعی اور مسلّم سمجھا جاتا

تھا بعد میں محض وہم و گمان ہی نکلے۔

لیکن قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کو نازل ہوئے مُدّتیں بیت گئیں پھر بھی موضوعات کی کثرت اور معانی کی رفعت کے باوجود اس کی کسی بات پر تنقید یا اعتراض ممکن نہیں ہوسکا، ضد اور ہٹ دھرمی کی بات الگ ہے۔

۵۔ قرآن اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی

قرآن کریم نے متعدد آیات میں مستقبل میں ہونے والے اہم واقعات کی خبر دی ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ قرآن کی دی ہوئی ہر خبر صحیح نکلی اور کبھی کوئی امر اس کے خلاف واقع نہیں ہُوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ غیب کی جو خبر دیتا ہے اس کا ذریعہ وحی و نبوّت کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

جن آیات میں غیب کی خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَیُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِہٖ وَیَقْطَعَ دَابِرَ الْکَافِرِیْنَ۔

(وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ (کفّارِ مکہ کی) ان دو جماعتوں میں سے ایک ضرور تمھارے ہاتھ آجائے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ تمھارا

سامنا کمزور جماعت سے ہو جب کہ اللہ یہ چاہتا تھا
کہ اپنی بات کو حق ثابت کرے اور کافروں کی جڑ
کاٹ دے۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۷)

یہ آیت غزوۂ بدر کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا کرنے اور کافروں کی جڑ کاٹنے کا وعدہ کیا تھا حالانکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور ساز و سامان کا بھی فقدان تھا۔ صرف مقدادؓ کے پاس یا ان کے اور زبیر بن العوام کے پاس سواری کا گھوڑا تھا جبکہ کافر کثرت میں تھے اور ان کی جنگی طاقت بھی زیادہ تھی، جیساکہ اس آیت میں بھی ان کو بہت طاقت ور کہا گیا ہے۔ مسلمان ان سے لڑتے ہوئے ڈر رہے تھے لیکن اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنی بات کا حق ہونا ثابت کردے۔ چنانچہ اس نے مومنوں کو اپنے ارادے سے مطلع کیا کہ وہ باطل پر حق کو غالب کرے گا اور پھر اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، انھیں دشمنوں پر فتح دی اور کافروں کی جڑ کاٹ دی۔

اخبار بالغیب کی ایک اور مثال یہ ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ. اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ.

آپؐ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ صاف صاف سُنا دیجیے اور مشرکوں کی پروا نہ کیجیے۔ یہ لوگ جو مذاق

اُڑاتے ہیں ان کے مقابلے میں ہم آپ کے لیے کافی ہیں
اور یہ مذاق اڑانے والے جو اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا
مانتے ہیں ان کو جلد معلوم ہو جائے گا۔

(سورۂ حجر۔ آیات ۹۴تا۹۶)

یہ آیات مکّہ میں نازل ہوئیں جب ابھی اسلامی دعوت
کی ابتدا تھی۔

بزّار اور طبرانی نے ان آیات کے سببِ نزول کے بارے
میں انس بن مالک سے روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکّہ کے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے تو وہ
آپؐ کے پیچھے اشارے کرنے لگے اور کہنے لگے، یہ کہتا ہے کہ میں نبی
ہوں اور میرے ساتھ جبرئیل ہیں[1] اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں
یہ خبر دی کہ اسلام کی دعوت پھیلے گی اور کامیاب ہو گی اور مشرکین
ناکام ہوں گے۔ یہ خبر اس وقت دی گئی تھی جب کسی کے وہم
و گمان میں بھی نہ تھا کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے گا اور نبی اکرمؐ
کو غلبہ حاصل ہو گا۔

اسی مضمون کی ایک اور آیت یہ ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْكَرِهَ
الْمُشْرِكُوْنَ .

---

[1] جلال الدین سیوطی۔ لباب النقول صفحہ ۱۳۲

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو سامانِ ہدایت (قرآن) اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس دین کو دوسرے سب ادیان پر غالب کرے۔ گو مشرک اس سے کیسے ہی ناخوش ہوں۔ (سورۂ صف۔ آیت ۹)

اخبار بالغیب کی ایک اور مثال یہ ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ۔

اہلِ روم قریب کے علاقے میں شکست کھا گئے لیکن وہ اپنے مغلوب ہونے کے چند ہی سال کے اندر غالب آجائیں گے۔ (سورۂ روم۔ آیت ۲-۳)

یہ پیش گوئی دس سال سے کم عرصے میں پوری ہوگئی۔ قیصرِ روم کو کسرائے ایران پر فتح ہوگئی اور اس کی فوج ایران کے علاقے میں داخل ہوگئی۔

ایک اور آیت ہے:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ جیت ہماری ہی جماعت کی ہوگی۔ ان کی جماعت جلد ہی شکست کھائے گی اور یہ لوگ اُلٹے پاؤں بھاگیں گے۔

(سورۂ قمر۔ آیات ۴۴-۴۵)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ کفّار کو شکست

ہوگی اور وہ ذلیل ہوں گے۔ پھر جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔
اس روز ابوجہل اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاکر آگے آیا اور پکار کر
کہاکہ آج ہم محمدؐ اور ان کے ساتھیوں پر غالب آئیں
گے مگر اللہ نے اس کو ہلاک کردیا، اس کی جماعت تباہ ہوگئی
اور حق کا بول بالا ہوا۔ مسلمان کفارِ مکّہ پر اس وقت فتحیاب
ہوئے جب کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ ۳۱۳ مسلمان
جن کے پاس سامان جنگ نہیں ہے اور صرف ایک دو گھوڑے
اور ستر اونٹ ہیں کہ جن پر یہ باری باری سوار ہوتے ہیں، ان
کافروں پر غالب آجائیں گے جن کی تعداد بھی کافی تھی اور جو
پوری طرح مسلح تھے، لیکن ہوا یہ کہ تھوڑی سی تعداد بڑی جمعیّت
پر غالب آگئی اور بڑی جمعیّت کی طاقت اور شان خاک میں
مِل گئی۔ اللہ کے حکم، نبوّت کے اِستحکام اور نیّت کی صِحّت
کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

ایک اور آیت ہے:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ..... سَيَصْلٰى
نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ.

ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہوجائے
..... وہ جلد بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی
بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے۔ (سورۂ لہب - آیات ۱-۴)

اِس سورت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ ابو لہب اور اس کی
بیوی اُمِّ جمیل بنتِ حرب دونوں جہنّمی ہیں۔ وہ زندگی بھر اسلام

قبول نہیں کریں گے اور ہُوا بھی یونہی ۔

٦۔ قرآن اور آفرینش کے راز

قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ آیات میں کائنات، نیچر اور افلاک کے ایسے قوانین کا انکشاف کیا ہے جن تک رسائی کا ذریعہ ابتدائے اسلام کے زمانے میں وحی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ قانون اس زمانے میں اہلِ یونان اور بعض ان دوسری قوموں کو معلوم تھے جنھیں سائنس کی کچھ واقفیت تھی لیکن جزیرہ نمائے عرب اس طرح کی معلومات سے بہت دور تھا۔ اس کے علاوہ کچھ قانون ایسے ہیں جن کا علم صرف سائنس کی ترقی اور نئے انکشافات کے بعد ہُوا۔ اس طرح کی اطّلاعات قرآن میں بکثرت ہیں۔ ان میں سے بعض قوانین صراحت سے بیان کیے گئے ہیں لیکن جہاں صرف اشارہ مناسب تھا وہاں اشارہ کر دیا گیا ہے کیونکہ بعض باتوں کا سمجھنا اس زمانے کے ناپختہ ذہنوں کے لیے دشوار تھا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ آنے والے زمانے میں جب سائنس ترقی کر جائے اور دریافتیں بکثرت ہو جائیں تو اس وقت کے لوگ انھیں سمجھ سکیں ۔

جن اسرار سے وحی نے پردہ اٹھایا ہے اور جن کی طرف متأخرین نے توجہ مبذول کی ہے ، ان میں اللہ کا یہ قول ہے :

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ.

ہم نے زمین میں ہمہ اقسام کی جو چیزیں اُگائی ہیں ان میں ایک خاص اندازہ اور وزن ہے۔ (سورہ حجر۔ آیت ۱۹)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز زمین سے اُگتی ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کا ایک مخصوص وزن ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز جو زمین سے اُگتی ہے وہ خاص اجزا سے مرکب ہوتی ہے اور ہر جزو اس میں ایک تناسب سے شامل ہوتا ہے۔ اگر کوئی جزو کم یا زیادہ ہو جائے تو پھر وہ کوئی اور چیز بن جائے گی۔ بعض اجزا کا تناسب اس قدر دقیق ہے کہ جو اوزان اور پیمانے انسان کو معلوم ہیں ان کی مدد سے اس کا بالکل صحیح تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور عجیب نکتہ جس کی طرف وحیِ الٰہی نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ بعض اقسام کے پودے اور درخت باروری کے لیے ہواؤں کے محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ

ہم ہی بارور کرنے والی ہوائیں بھیجتے رہتے ہیں۔

(سورۂ حجر۔ آیت ۲۲)

اگرچہ قدیم مفسّرین نے اس آیت کے یہ معنیٰ بیان کیے ہیں کہ ہم ایسی ہوائیں بھیجتے ہیں جو بادلوں کو یا بارش کو اٹھائے پھرتی ہیں لیکن یہ معنیٰ بیان کرتے وقت دقّتِ نظر سے کام نہیں لیا گیا اور اب تو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہوائیں بادلوں کو اُٹھاتی نہیں

بلکہ انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ نباتیات کے ماہروں کی دریافت کو پیشِ نظر رکھ کر اگر اس آیت کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو ایک عجیب نکتہ سامنے آتا ہے جس کو سمجھنے سے متقدمین قاصر تھے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ درختوں اور پودوں کو باروری کے لیے زرگل کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بعض اوقات ہوا ہی کے ذریعے سے صحیح جگہ پر پہنچتا ہے۔ خوبانی، صنوبر، انار، سنترہ اور کپاس وغیرہ میں یہی صورت ہے۔ جب زرگل تیار ہو جاتا ہے اور کلیاں کھل جاتی ہیں تو نَر پھولوں کا زیرہ ہوا سے اُڑ کر خودبخود مادہ پھولوں کے بقچہ میں جا گرتا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ نَر اور مادّہ صرف جانوروں ہی میں نہیں ہوتے بلکہ تمام اقسام کی نباتات میں نَر اور مادہ موجود ہیں:

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ.

اللہ نے زمین پر ہر قسم کے پھلوں نے جوڑے بنائے۔ (سورۂ رعد۔ آیت ۳)

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ.

پاک ہے وہ ذات جس نے زمین پر اُگنے والی ہر چیز کے جوڑے بنائے اور خود ان لوگوں کے بھی اور ان چیزوں کے بھی جن کو یہ نہیں جانتے۔

(سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۳۶)

ایک اور نکتہ جس کا قرآن نے انکشاف کیا، زمین کی حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا ۔

وہ جس نے زمین کو تمھارے لیے گہوارہ بنایا۔

(سورۂ طٰہٰ - آیت ۵۳)

غور کیجیے کہ اس آیت میں زمین کی حرکت کی طرف وہ خوبصورت اشارہ موجود ہے جس کا راز صدیوں بعد کھلا۔ زمین کے لیے گہوارہ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ گہوارہ شیر خوار بچّے کے لیے بنایا جاتا ہے اور اس کو آہستہ آہستہ ہلایا جاتا ہے تاکہ بچّہ اس میں آرام سے سوتا رہے۔ زمین بھی بنی نوعِ انسان کے لیے گہوارہ ہے اور اس کی حرکت ان کے مناسب حال ہے جس طرح گہوارے کو بچّہ کی پرورش اور آرام کے لیے ہلایا جاتا ہے اسی طرح زمین کی یومیہ اور سالانہ حرکت بھی انسانوں بلکہ تمام حیوانات، نباتات اور جمادات کی پرورش کے لیے ہے۔

اگرچہ اس آیت میں زمین کی حرکت کی طرف ایک خوبصورت اشارہ موجود ہے لیکن اس کی صراحت نہیں۔ اس لیے کہ یہ آیت جس زمانے میں نازل ہوئی تھی اس زمانے میں زمین کے ساکن ہونے پر سب لوگوں کا اتفاق تھا، بلکہ اس کو ایسی بدیہی بات سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا[1]

---

[1] مشہور اطالوی سائنسدان گلیلیو (۱۵۶۴ ـــ ۱۶۴۲ عیسوی) نے ۱۰۰۰ھ

ایک اور راز جو قرآن نے ۱۴۰۰ سو سال قبل منکشف کیا وہ ایک اور براعظم کا وجود ہے۔ اللہ سبحانہ نے کہا ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۔

وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔ (سورۂ رحمٰن۔ آیت ۱۷)

اس آیت پر مفسّرین نے صدیوں دماغ سوزی کی ہے اور اس کی تفسیر طرح طرح سے کی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سورج اور چاند کے طلوع اور غروب ہونے کی سمتیں مراد ہیں اور بعض نے سردی اور گرمی میں طلوع وغروب کی سمتیں مراد لی ہیں لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دو مشرقوں اور مغربوں سے ایک ایسے برّاعظم کے وجود کی طرف اشارہ ہے جو سطح زمین کے دوسرے رخ پر واقع ہے اور جہاں آفتاب اس وقت نکلتا ہے، جب ہمارے یہاں غروب ہوتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

کے بعد یہ جرأت کی کہ زمین کی حرکت سورج کے گرد اور خود اپنے گرد ثابت کرے۔ اس پر اسے خوب ذلیل کیا گیا اور اتنا پریشان کیا گیا کہ وہ مرنے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے علمی مرتبہ کے باوجود اسے ایک طویل عرصہ قید خانے میں گزارنا پڑا۔ چنانچہ یورپ کے سائنس دان اپنی وہ علمی اور مفید دریافتیں جو قدیم اور فرسودہ خیالات کے خلاف تھیں رومن کیتھولک چرچ کے خوف سے چھپانے لگے۔ (الہیئۃ والاسلام صفحہ ۶۳ مطبوعہ بغداد)

يَا لَيْتَ بَيْنِي وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ۔

کاش میرے اور تیرے درمیان دو مشرقوں کا فاصلہ ہوتا۔ غرض (شیطان بھی) کیا بُرا ساتھی ہے۔

(سورۂ زخرف۔ آیت ۳۸)

اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو مشرقوں کا فاصلہ بعید ترین فاصلہ ہے جو محسوس کیا جاسکتا ہے، لہذا اس سے نہ تو چاند اور سورج کے طلوع ہونے کی سمتیں مراد لی جاسکتی ہیں، نہ گرمی اور سردی کے موسم میں سورج کے طلوع ہونے کی سمتیں۔ کیونکہ ان کے درمیان طویل ترین محسوس مسافت نہیں ہے۔ اِس لیے ضروری ہوا کہ مشرق ومغرب کا درمیانی فاصلہ مراد لیا جائے اور یہ تعبیر صرف اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب کرۂ ارض کے ایک جزو کا مشرق دوسرے جزو کا مغرب ہو۔ اس طرح اِس آیت سے زمین کے ایک دوسرے جزو کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جزو جسے "امریکہ" کہا جاتا ہے، نزولِ قرآن سے سینکڑوں برس بعد دریافت ہوا۔

جن آیات میں مشرق ومغرب کے لیے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہاں مطلق مشرق ومغرب بحیثیت ایک نوع کے مراد ہے۔ جیسے اس آیت میں:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

سب سمتیں اللہ ہی کی ہیں، مشرق بھی اور مغرب بھی۔ تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ ہے۔

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۵)

جن آیات میں تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، وہاں سطح زمین کے دوسرے رُخ پر واقع برِّاعظم کی طرف اشارہ ہے۔

جن آیات میں جمع کا صیغہ آیا ہے وہاں مشارق و مغارب سے کرۂ ارض کے مختلف اجزا مراد ہیں۔

ایک اور نکتہ جس کی طرف قرآنِ مجید میں اشارہ ہے وہ زمین کا گول ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا۔

ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور سمجھے جاتے تھے اس سرزمین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا۔

(سورۂ اعراف۔ آیت ۱۳۷)

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔

وہ پروردگار ہے آسمانوں کا زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اور پروردگار ہے مشارق کا۔

(سورۂ صافّات۔ آیت ۵)

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقَادِرُوْنَ۔

قسم ہے مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی!
کہ ہم قدرت رکھتے ہیں۔ (سورہ معارج - آیت ۴۰)

یہ آیات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ سورج کے طلوع و غروب کی جگہیں بہت ہیں۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ زمین گول ہے۔ جب سورج کرۂ ارض کے کسی حصہ میں طلوع ہوتا ہے تو وہ اس وقت لازماً کسی دوسرے حصے میں غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح مشارق و مغارب کا تعدّد واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کا تکلّف ہے نہ کوئی بیجا بات۔

قرطبی وغیرہ نے مشارق و مغارب کا مطلب یہ لیا ہے کہ سال کے مختلف ایام میں سورج کے طلوع و غروب کی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ مطلب لینے میں قدرے نامناسب تکلّف سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ اس طرح سورج کے طلوع ہونے کی کوئی معین جگہ نہیں رہتی جس کی قسم کھائی جا سکے بلکہ ہر مقام پر اس کے محلِ وقوع کے لحاظ سے سورج کا مطلع مختلف ہو جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ مطلب لیا جائے کہ زمین کے گول ہونے اور حرکت کرنے کی وجہ سے طلوع و غروب میں جو آہستہ آہستہ فرق پڑتا ہے اس کو مشارق اور مغارب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ائمہؑ اہلبیت علیہم السلام کے اخبار و آثار، خطبوں اور دعاؤں میں بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جو زمین کے گول ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
کسی سفر میں ایک شخص میرے ساتھ ہوگیا۔ وہ مغرب کی نماز کامل تاریکی چھا جانے کے بعد پڑھتا تھا اور فجر کی نماز اس وقت پڑھتا تھا جب ابھی اندھیرا ہوتا تھا۔ میں مغرب کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد اور فجر کی نماز صبح صادق کے وقت پڑھتا تھا۔ اس شخص نے کہا: "آپ اس طرح کیوں نہیں کرتے، جس طرح میں کرتا ہوں۔ سورج ہمارے یہاں طلوع ہونے سے پہلے کہیں اور نکل آتا ہے اور ہمارے یہاں غروب ہونے سے پہلے کہیں اور غروب ہوجاتا ہے۔" میں نے جواب دیا کہ "ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسی وقت نماز پڑھیں جب ہمارے یہاں سورج غروب ہوجائے اور جب ہمارے یہاں فجر طلوع ہو جائے۔ دُوسرے لوگ اس وقت نماز پڑھیں جب ان کے یہاں سورج غروب ہو"[1]

وہ آدمی زمین کے گول ہونے کی وجہ سے طلوع و غروب کے اوقات میں جو تفاوت ہوتا ہے اس سے استدلال کر رہا تھا، امامؑ نے اس کی تردید نہیں کی، البتہ اس کا دینی فریضہ اسے یاد دلا دیا۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد اول صفحہ ۲۳۷ باب ۱۱۶ ان اول وقت المغرب غروب الشمس۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کا یہ قول منقول ہے :

إِنَّمَا عَلَيْكَ مَشْرِقَكَ وَمَغْرِبَكَ

تمھیں اس کا خیال رکھنا ہے کہ تمھارے یہاں سورج کب نکلتا ہے اور کب ڈوبتا ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی صبح وشام کی دُعا میں یہ الفاظ آئے ہیں :

اس دن دونوں (دن اور رات) میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص حد اور ایک خاص مدّت مقرر کی ہے۔ وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اُس کے ساتھی میں داخل کرتا ہے اور اُس کے ساتھی کو اِس میں داخل کرتا ہے، اس انداز کے مطابق جو اس نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے[1]

ان الفاظ میں امامِ عالی مقام نے نہایت منفرد انداز میں زمین کے گول ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چونکہ اس زمانے کے لوگ اس بات سے بالکل ناواقف تھے اور یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی، اس لیے امامؑ نے جو اسالیب کے ماہر تھے، ایک لطیف اور بلیغ طریقے سے اس طرف اشارہ کافی سمجھا۔ اگر امامؑ کو صرف اس پیش پا افتادہ بات کو بیان کرنا منظور ہوتا کہ

---

[1] الصحیفۃ السجادیۃ الکاملۃ۔

کبھی رات گھٹ جاتی ہے اور اس کا وقت دن میں شامل ہوجاتا ہے تو وہ اُس پہلے ہی جملہ پر اکتفا کرتے کہ وہ ان میں سے ہرایک کو اس کے ساتھی میں داخل کرتا ہے اور یہ اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے کہ پھر ساتھی کو اس میں داخل کرتا ہے، لہذا یہ دوسرا جملہ جو حالیہ ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب دن اور رات اپنے ساتھی میں داخل ہوتے ہیں تو ساتھی بھی ان میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے زمین کا گول ہونا ظاہر ہوتا ہے ۔ مثلاً جب ہمارے یہاں رات دن میں داخل ہوتی ہے تو کسی اور جگہ دن رات میں داخل ہوجاتا ہے یعنی کہیں دن لمبا ہوتا ہے اور کہیں رات ۔ اگر امامؑ کا مقصد اس نکتہ کی طرف اشارہ نہ ہوتا تو دوسرا جملہ بیکار تھا اور اس سے بجز تکرارِ معنوی کے کوئی فائدہ نہ ہوتا ۔

یہ ظاہر کرنے کے لیے اِتنا ہی کافی ہے کہ قرآن وحیِ الٰہی ہے اور اس کی مثل لانا انسان کی طاقت سے باہر ہے ۔

قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کی دلیل میں بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ یہی وہ واحد مدرسہ تھا جہاں سے امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فارغ التحصیل ہوئے ، جن کے کلمات کو سمجھ لینے پر ہر متبحّر عالم فخر محسوس کرتا ہے اور ہر محقّق ان کے چشمۂ علوم سے سیراب ہوتا ہے ۔ آپؑ کے خطبات نہج البلاغہ میں موجود ہیں ۔ جب آپؑ کوئی موضوع لیتے ہیں تو پھر کسی کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے ۔ آپؑ کی سیرت سے ناواقف شخص کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید آپؑ نے ساری عمر اس موضوع کی تحقیق

اور بحث میں صرف کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؑ کے علوم و معارف کا تعلق بھی وحی ہی سے ہے، کیونکہ وہ اسی سرچشمہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ جو شخص جزیرہ نمائے عرب خصوصاً حجاز کی تاریخ سے واقف ہے وہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا کہ ان علوم کا سرچشمہ وحی کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ نہج البلاغہ کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ خالق کے کلام سے کمتر اور مخلوق کے کلام سے برتر ہے۔[1]

میں پھر کہتا ہوں کہ امام علی علیہ السلام کی طرف سے اعجازِ قرآن کی تصدیق خود اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن وحیِ الٰہی ہے۔ کیونکہ فصاحت و بلاغت اور علوم و معارف میں ان کا جو مقام ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس لیے ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان کی تصدیق کسی ناواقفیت یا غلط فہمی کا نتیجہ ہو۔

امام علیؑ فصاحت و بلاغت کے حاکم علی الاطلاق اور تمام علوم و معارفِ اسلامی کا سرچشمہ ہیں۔ ان کے فضل و کمال کا ہر موافق و مخالف کو اعتراف ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کی تصدیق کا منشا دنیاوی منفعت کا حصول یا مال وجاہ کی طلب ہو۔ کیونکہ وہ خود زہد و تقویٰ کا بلند مینار ہیں۔ انھوں نے دنیا اور اس کی جھوٹی شان و شوکت کو ٹھکرا دیا تھا۔ جب انھیں مسلمانوں کی سربراہی اس شرط پر پیش کی گئی کہ وہ شیخین

---

[1] انه دون كلام الخالق وفوق كلام المخلوقين.

کے طریقے پر چلیں تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؑ نے مصلحتاً بھی چند روز کے لیے معاویہ کو ان کے منصب پر باقی رکھنا گوارا نہیں کیا حالانکہ آپؑ معاویہ کی معزولی کے نتائج سے بے خبر نہیں تھے۔ ان حالات میں ان کی طرف سے اعجازِ قرآن کی تصدیق حقیقی اور ایک امر واقعی کی تصدیق ہے جس کی بنیاد ان کے ایمانِ صادق پر ہے۔ یہی بات صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے۔

اعجازِ قرآن کے بارے میں شبہات

قرآن نے تمام بنی نوعِ انسان کو مقابلہ کی دعوت دے کر ان سے کہا کہ اگر ہو سکے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لائیں، لیکن کسی کو بھی مقابلے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ مخالفین جب قرآن کی یہ کامیابی برداشت نہ کر سکے تو انھوں نے قرآن کی عظمت وشوکت کو کم کرنے اور اپنے غلط تصوّرات کی تائید کے لیے خیال بافیوں کا سہارا لینا شروع کیا۔ بہتر ہوگا کہ ہم ان لوگوں کی خیال بافیوں پر بھی ایک نظر ڈالیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا علمی مرتبہ کیا ہے اور کس طرح ان کی خواہشات نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ

ا۔ قرآن میں ایسے کئی جملے ہیں جو فصاحت وبلاغت کے

منافی ہیں۔ کیونکہ ان میں عربی زبان کے قواعد کے لحاظ
سے متعدد غلطیاں ہیں۔ پس ایک ایسی کتاب جس
میں زبان کی غلطیاں ہوں وہ معجزہ نہیں ہوسکتی۔
یہ استدلال دو وجہ سے باطل ہے:
اوّلاً: قرآن فصحائے عرب کے سامنے نازل ہوا، اس
نے انھیں مقابلے کی دعوت دی اور کہا کہ اس جیسی ایک ہی
سورت بنالائیں۔ قرآن نے یہ بھی کہا کہ تمام مخلوق مل کر بھی
ایسا نہیں کرسکتی۔ اگر قرآن میں زبان کی غلطیاں ہوتیں تو
فصحائے عرب جو زبان کی خوبیوں اور اس کے اسلوب بیان سے
پوری طرح واقف تھے، ضرور اعتراض کرتے اور اس کے بعد
انھیں زبان یا تلوار سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی قطعاً ضرورت
باقی نہ رہتی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو تاریخ میں ضرور
اس کا تذکرہ ہوتا اور دشمنانِ اسلام نسلاً بعد نسلٍ اس کا
تواتر سے چرچا کرتے رہتے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اس طرح
کی کوئی خبر واحد بھی موجود نہیں۔
ثانیاً: جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، عربی گرامر کا
نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یہ قواعد بعد میں عرب فصحاء کے
کلام کے تتبّع اور استقرار کے نتیجہ میں وضع کیے گئے۔ قرآن کو
اگر مخالفین کے کہنے کے مطابق وحیِ الٰہی نہ بھی تسلیم کیا جائے
تو بھی یہ دوسرے فصحائے عرب کے کلام سے کمتر نہیں۔ بلکہ درجۂ
کمال کا فصیح و بلیغ عربی کلام ہے اور اس بنا پر عربی قواعد کا

ایک اہم ماخذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عربی زبان کا کوئی قاعدہ قرآن کے خلاف ہے تو یہ اس قاعدے کی کمزوری ہے۔ اِس سے قرآن کی زبان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں قرآن پر کوئی ایسا اعتراض اسی وقت وارد ہوسکتا ہے جب قرآن کی تمام قرائتیں کسی زیرِ بحث عبارت پر متفق ہوں۔ ورنہ جیساکہ ثابت ہے یہ قرائتیں خود قُرّاء کا اجتہاد ہیں اور نبی اکرمؐ سے تواتر کے ساتھ ثابت نہیں ہیں۔ اِس لیے اگر کسی ایک قراءت پر اعتراض وارد ہوتا ہو تو یہ اس قراءت کے غلط ہونے کی دلیل ہوگا، قرآن کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک اور شبہ یہ بیان کیا جاتا ہے :

۲ ۔ اگر انسان اس کی نظیر نہ بھی پیش کرسکیں جب بھی کوئی فصیح و بلیغ کلام معجزہ نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اس کی بلاغت کا علم صرف کچھ خاص لوگوں کو ہوتا ہے جبکہ معجزہ وہ ہوتا ہے کہ جس کا اعجاز سب لوگوں کو معلوم ہوسکے، کیونکہ ہر شخص اس صاحبِ معجزہ نبی کی تصدیق کا مکلّف ہوتا ہے۔

جواب

جیسے پہلے شبہ کی دلیل کمزور اور قیاس غلط تھا، یہی حال اِس شبہ کا بھی ہے، اِس لیے کہ معجزہ کے لیے قطعاً یہ شرط نہیں کہ اس کے اعجاز کو تمام بنی نوعِ انسان سمجھ سکیں۔ اگر ایسی شرط

لگائی گئی تو پھر ایک بھی معجزہ اعتراض کی زد سے نہیں بچ سکے گا۔ اعجاز کو صرف ایک مخصوص جماعت ہی محسوس کر سکتی ہے، باقی لوگوں کو متواتر نقل سے اس کا علم ہوتا ہے۔ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اس معاملے میں قرآن کو باقی تمام معجزات پر ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ دوسرے معجزوں کا تواتر ختم ہو سکتا ہے لیکن قرآن ایک ابدی معجزہ ہے، یہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک عرب قوم باقی ہے، بلکہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک عربی زبان کی خصوصیات کو سمجھنے والا باقی رہے گا، چاہے وہ خود عرب نہ ہو۔

ایک اور شبہہ یہ بیان کیا جاتا ہے :

۳۔ جو شخص عربی جانتا ہے وہ قرآنی الفاظ جیسے لفظ استعمال کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ وہ قرآن کی نظیر پیش کر سکے، کیونکہ قرآنی الفاظ کی نظیر پیش کرنا اور خود قرآن کی نظیر پیش کرنا برابر ہے۔

جواب

یہ شبہہ اس قابل بھی نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ قرآن کے کسی لفظ کی نظیر پیش کرنا تو درکنار قرآن کے کسی جملہ کی بھی نظیر پیش کر سکنے کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن یا اس کی کسی سورت کی نظیر پیش کی جا سکتی ہے۔ خام مال پر قدرت کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس کو جوڑ کر مطلوبہ چیز بنانے پر بھی قدرت ہے۔ یہ کہنا

قطعاً درست نہیں کہ چونکہ ہر شخص عمارت میں ایک اینٹ لگا سکتا ہے اس لیے ہر شخص عالیشان محل اور بڑے بڑے قلعے بھی تعمیر کر سکتا ہے۔ نہ یہ کہنا درست ہے کہ چونکہ ہر عرب، عربی الفاظ استعمال کر سکتا ہے اس لیے وہ عربی میں قصیدے بھی کہہ سکتا ہے اور خطبات بھی دے سکتا ہے۔ اسی شبہ کی بنا پر نظام اور اس کے ہمنوا اس بات کے قائل تھے کہ قرآن کے اعجاز کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو قرآن کی نظیر پیش کرنے سے روک دیا ہے۔ لیکن یہ نہایت رکیک قول ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ روک دینے سے اگر یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو کسی انسان کو یہ طاقت دے سکتا تھا کہ وہ قرآن کی نظیر پیش کرے لیکن اللہ نے ایسی طاقت کسی کو نہیں دی جب تو یہ کہنا درست ہے، لیکن اس میں قرآن کی کوئی خصوصیت نہیں۔ سب معجزات کی یہی صورت ہے۔ لیکن اگر یہ مطلب ہے کہ انسان قرآن کی نظیر پیش تو کر سکتے ہیں لیکن اللہ نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا ہے تو یہ بداہتاً غلط ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں نے قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور انھیں اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہوتا کہ قرآن کے اعجاز کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کو اس کی نظیر پیش کرنے سے روک دیا ہے تو پھر ضروری تھا کہ قرآن کی اس تحدّی سے پہلے کے عربوں کے کلام میں قرآن کی سی فصاحت و بلاغت موجود ہوتی۔ اگر اس

طرح کی کوئی چیز موجود ہوتی تو وہ مختلف اسباب کی بنا پر ضرور تواتر کے ساتھ منقول ہوتی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ ایسی کوئی چیز موجود تھی اور نہ منقول ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن معجزۂ الٰہی ہے اور اس کی نظیر پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ایک شبہ یہ بیان کیا جاتا ہے:

۴۔ اگر قرآن کا اعجاز تسلیم بھی کرلیا جائے جب بھی یہ اپنے پیش کرنے والے کی نبوّت کی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ قرآن میں جو نبیوں کے قصے بیان کیے گئے ہیں وہ عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی کتابوں کے ان قصوں سے مختلف ہیں جن کا وحیِ الٰہی ہونا بالتواتر ثابت ہے۔

جواب

قرآن میں وہ لغو اور لایعنی قصّے نہیں ہیں جو عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے نہ ہونے ہی سے یہ امر ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن واقعی وحی الٰہی ہے۔ قرآن نے کوئی ایسی بات اللہ اور اس کے انبیاء سے منسوب نہیں کی جو خلافِ عقل ہو۔ پس کتبِ عَہْدَین سے اختلاف خود قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ ہم گزشتہ اوراق میں عہدنامۂ قدیم اور عہدنامۂ جدید میں پائے جانے والی خرافات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں۔

ایک شبہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے:

۵۔ قرآن میں تضاد ہے اس لیے یہ وحیِ الٰہی نہیں ہوسکتا۔ یہ

تضاد دو جگہ بتایا جاتا ہے :

ایک تو یہ کہ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۔ تمھاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک بات نہ کرسکو گے بجز اشارہ کے ۔(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۴۱)

اور دوسرے یہ کہ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۔ تمھاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے برابر تین رات تک بات نہ کرسکو گے ۔ (سورۂ مریم۔ آیت ۱۰)

جواب

پہلی آیت میں یوم کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسری میں لیل کا ۔ عربی زبان میں یوم سے مراد کبھی دن کا وقت ہوتا ہے جیسے اس آیت میں :

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا

جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کر دیا تھا ۔ (سورۂ حاقہ۔ آیت ۷)

اور کبھی دن اور رات کا مجموعہ جیسے اس آیت میں :

تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ ۔

تم اپنے گھر میں تین دن اور بسر کر لو ۔

(سورۂ ہود۔ آیت ۶۵)

اُردو میں بھی "دن" کا لفظ ان دونوں معنیٰ میں استعمال

ہوتا ہے اور یہی حال فارسی میں لفظ "روز" کا اور انگریزی میں DAY کا ہے۔

عربی زبان میں لفظ لَیل (رات) سے بھی کبھی دن چھپنے کے بعد کا وقت مراد ہوتا ہے۔ جیسے ان آیات میں:

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۔

قسم ہے رات کی جب وہ سورج کو چھپا لے۔

(سورۂ لیل - آیت ۱)

سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ۔

سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کر دیا تھا۔

(سورۂ حاقّہ - آیت ۷)

اور کبھی "رات اور دن کا مجموعہ" مراد ہوتا ہے۔ جیسے اس آیت میں:

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے وعدہ کیا تھا موسیٰؑ سے چالیس رات کا۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۵۱)

یَوْم اور لَیْل کے الفاظ کا استعمال ان دونوں معنیٰ میں بہت عام ہے۔ جن دو آیتوں میں تناقض کا دعویٰ کیا گیا ہے ان دونوں میں دن اور رات کا مجموعہ مراد ہے۔ لہٰذا ان ہر دو آیات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ ایک دوسری کی وضاحت اور تائید کرتی ہیں۔

جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس میں قطعاً کوئی ابہام

نہیں لیکن شبہ پیش کرنے والا بزعمِ خود قرآن کو الزام دینے کے لیے حقیقت کو نظرانداز کر رہا ہے۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کی انجیل کی ان دو آیتوں میں کتنا تضاد ہے :

انجیل متّی کے بارھویں باب میں ہے کہ "مسیح نے کہا کہ میں تین دن اور تین رات زمین میں مدفون رہوں گا" مگر خود انجیل متّی اور باقی تینوں انجیلیں اس بات پر متفق ہیں کہ مسیح صرف جمعہ کے دن کا آخری کچھ حصّہ، ہفتہ کی رات اور ہفتہ کا دن اور اتوار کی رات فجر سے پہلے تک زمین میں مدفون رہے" اب انجیل متّی کے مصنف سے اور ان لوگوں سے جو اس کے الہامی ہونے کے معتقد ہیں، ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ تین دن اور تین رات کیسے ہوئے؟

عجیب بات ہے کہ مغرب کے اہلِ علم اور مفکّرین، عہدنامۂ قدیم اور عہدنامۂ جدید کے صحیفوں پر تو ایمان لاتے ہیں کہ جو خرافات اور تضادات سے بھرے ہوئے ہیں اور نہیں ایمان لاتے تو قرآن پر کہ جو انسانی ہدایت کا ضامن ہے اور جو دنیا و آخرت کی کامیابی اور فوز و فلاح کی طرف انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تعصّب لاعلاج بیماری ہے اور جیسا کہ ہم نے گزشتہ اوراق میں کہا ہے، متلاشیانِ حق کی تعداد بہت بہت کم ہے۔

تضاد کی دوسری مثال یہ دی گئی ہے کہ کبھی تو فعل بندہ سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کام

کرسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ.

جس کا دل چاہے ایمان لے آئے اور جس کا دل چاہے کفر اختیار کرے۔ (سورۂ کہف۔ آیت ۲۹)

اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ مختار ہے۔ لیکن کہیں یہ کہا گیا ہے کہ اختیار صرف اللہ کو ہے، جیسا کہ اس آیت میں :

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ.

اللہ کے چاہے بغیر تم کوئی بات چاہ نہیں سکتے۔

(سورۂ دہر۔ آیت ۳۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ مجبور ہے۔ یہ صریح تضاد ہے۔ ان آیات کی تاویل کرنا خلافِ ظاہر اور بے دلیل ہے۔

جواب

ہر انسان کو فطری طور پر معلوم ہے کہ بہت سے کاموں پر اسے قدرت حاصل ہے۔ وہ چاہے تو وہ کام کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ یہ فطری بات ہے جس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، سوائے اس کے کہ اس کے دل میں کہیں باہر سے شبہ نہ ڈالا گیا ہو۔

جو شخص کوئی اچھا کام کرتا ہے سب ہوش مند اُس کی تعریف کرتے ہیں اور جو شخص کوئی بُرا کام کرتا ہے سب

ذی ہوش اس کی مذمّت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے، مجبور نہیں۔ ہر ہوش مند کو یہ بھی معلوم ہے کہ جب وہ زمین پر چلتا ہے تو اس کی حرکت مختلف ہوتی ہے اس سے کہ جب وہ کہیں اونچائی سے زمین پر گرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پہلی حرکت میں وہ مختار ہے اور دوسری میں مجبور۔ اسی طرح ہر ذی ہوش انسان فطری طور پر یہ بھی جانتا ہے کہ گو وہ بہت سے کام اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن جہاں تک ان کاموں کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کا تعلق ہے اس کے اکثر پہلو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً خود اس کا وجود، اس کی زندگی، کسی کام کا احساس اور اس کی طرف رغبت، کام کا اس شخص کے بس میں ہونا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں آدمی کے اپنے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ ان سب چیزوں کو معرضِ وجود میں لانے والا وہی ہے جو خود انسان کا موجد ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ ان چیزوں کو معرضِ وجود میں لانے والا خالق ان کی ایجاد کے بعد تخلیق کے کام سے دستبردار نہیں ہوگیا۔ تمام چیزوں کی بقا اور ان کے وجود کا تسلسل ہر آن ایک مؤثر کا محتاج ہے۔ خالقِ کائنات کا کام ایک معمار کا سا نہیں کہ اس نے ایک دفعہ دیوار بنادی تو پھر دیوار کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر معمار فنا بھی ہو جائے تو دیوار باقی رہتی ہے۔ نہ خالق کی مثال کسی کتاب کے مصنّف کی سی ہے، کتاب کو وجود میں لانے کے لیے تو مصنّف کی ضرورت ہوتی ہے

لیکن اپنی بقا کے لیے وہ مصنف کی محتاج نہیں۔ خُدا تو وہ ہے کہ جس کو کسی چیز سے تشبیہ دی ہی نہیں جاسکتی۔ لیکن اگر بطورِ مثال تشبیہ دی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مثال بجلی کی رَو کی سی ہے کہ روشنی کے لیے ہر لمحہ بجلی کی رَو کی ضرورت ہے اگر بجلی کا تار طاقت کے سرچشمہ سے جُدا ہوجائے تو روشنی اس طرح غائب ہوجائے گی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اسی طرح یہ ساری کائنات اپنے وجود اور بقا کے لیے ہر لمحہ خالق کی مدد کی محتاج ہے اور اس کی رحمت سے ہر وقت اس کا تعلق قائم و دائم ہے۔ اس بنا پر بندہ اپنے افعال میں نہ مجبور ہے نہ اسے کلّی اختیار حاصل ہے۔ اختیار اور جبر دونوں سے اُسے حصّہ ملا ہے۔ بندہ جب کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے میں اپنی طاقت استعمال کرتا ہے گو وہ اپنے اختیار سے ایسا کرتا ہے لیکن یہ طاقت بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور وہی اس کام کے لیے ضروری شرائط اور مناسب ماحول فراہم کرتا ہے۔ اس لیے اس کام کو ایک لحاظ سے بندہ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور دُوسرے لحاظ سے اللہ کی طرف اور قرآنی آیات میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے افعال میں بندہ کے با اختیار ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا اختیار غیر مؤثر ہو گئے۔

یہ وہی اَلْاَمْرُ بَیْنَ الْاَمْرَیْن کا مسئلہ ہے کہ جس کے شیعہ امامیہ معتقد ہیں اور ان کے ائمہ عؑ نے بھی اس موضوع کو اہمیت دیتے ہوئے "نظریۂ جبر" اور "نظریۂ تفویض" کو باطل

قرار دیا ہے۔

موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم آپ کے لیے ایک سادہ سی مثال بیان کرتے ہیں تاکہ بات پوری طرح واضح ہوجائے:

فرض کیجیے کہ کسی شخص کا ہاتھ مفلوج ہے، وہ اُسے خُود سے حرکت نہیں دے سکتا لیکن ڈاکٹر برقی رَو کی مدد سے اس میں وقتی طور پر حرکتِ ارادی پیدا کرسکتا ہے۔ جب بجلی کا تار اس کے ہاتھ سے جوڑ دیا جاتا ہے وہ اسے حرکت دینے پر قادر ہوجاتا ہے اور جب تار ہٹا دیا جاتا ہے تو وہ بالکل ہاتھ نہیں ہلاسکتا۔ اب اگر تجرباتی طور پر ڈاکٹر نے اس بیمار ہاتھ سے بجلی کا تار جوڑ دیا اور وہ شخص اس بجلی کی طاقت کی مدد سے جو اسے برابر پہنچ رہی ہے اپنے ہاتھ کو حرکت دینے اور اس سے کام لینے لگا تو اس صورت میں نہ تو ہاتھ کی حرکت کو پورے طور پر اس شخص سے منسوب کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ حرکت بجلی کی طاقت پر موقوف ہے جسے ہم نے فرض کیا ہے کہ ڈاکٹر ہاتھ تک پہنچا رہا ہے اور نہ ہی اس حرکت کو کلّی طور پر ڈاکٹر سے منسوب کیا جاسکتا ہے کیونکہ مریض اپنے ارادہ سے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتا ہے اور وہ اس حرکت پر مجبور نہیں ہے لیکن اسے کلّی اختیار بھی نہیں ہے کیونکہ اسے باہر سے مدد مل رہی ہے۔ تو یہ صُورت ہوئی جبر اور اختیار کے بین بین۔ وہ سب افعال جو انسانوں سے بحیثیت فاعلِ مختار سرزد ہوتے ہیں، ان کی یہی نوعیت ہے فعل سرزد ہوتا ہے بندہ کی مشیت سے مگر بندہ کی مشیت

اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو۔ سب قرآنی آیات میں اسی صورت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے جبر کی تردید ہوتی ہے جس کے اکثر علمائے عامّہ قائل ہیں۔ کیونکہ ان سے اختیار ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تفویض یعنی کلّی اختیار کی بھی تردید کرتی ہیں جس کے "مفوّضہ" قائل ہیں۔ کیونکہ یہ آیات افعال کو اللہ سے منسوب کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا تجزیہ اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کے ارشادات اور ان کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلہ کی بعض روایات ملاحظہ ہوں :-

> ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بندوں کو گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کیا ہے ؟ آپؑ نے فرمایا: نہیں ۔ میں نے کہا : تو کیا اللہ نے انھیں مکمل آزادی دیدی ہے کہ جو چاہیں کریں ؟ آپؑ نے فرمایا : نہیں۔ میں نے کہا تو پھر اس کی کیا صورت ہے ؟ آپؑ نے فرمایا کہ اللہ کے لُطف وکرم کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کے بین بین حالت ہو۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے ایک اور روایت میں

---

[1] اصول الکافی، کتاب التوحید باب الجبر والقدر والامر بین الامرین۔

ہے کہ

لَا جَبْرَ وَلَا قَدَرَ وَلٰکِنْ مَنْزِلَۃٌ بَیْنَھُمَا۔

نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ دونوں کے درمیان کا درجہ ہے۔[1]

مکتبِ اہلِ بیتؑ کی کتبِ حدیث میں ایسی وافر روایات موجود ہیں۔

ایک اور شبہ یہ بیان کیا گیا ہے :

۶۔ اگر کسی ایسی کتاب کا پیش کرنا معجزہ ہوتا جس کی نظیر پیش کرنے سے دوسرے انسان قاصر ہوں تو اقلیدس اور مجسطی کی کتابیں بھی معجزہ سمجھی جاتیں۔ چونکہ یہ کتابیں معجزہ نہیں ہیں اس لیے اس قضیہ کا پہلا جزو ہی غلط ہے۔

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دو کتابوں کی نظیر پیش کرنے سے انسان قطعاً عاجز نہیں ہے اور یہ محض ایک غلط خیال ہے۔ بعد کے لوگوں نے ہندسہ اور ہیئت کی ان سے زیادہ واضح اور سہل کتابیں لکھی ہیں جو کئی لحاظ سے ان کتابوں سے بہتر ہیں اور ان میں ایسے اضافے پائے جاتے ہیں جن کا ان پہلی کتابوں میں وجود نہیں۔

---

[1] اصول الکافی، کتاب التوحید، باب الجبر والقدر والامر بین الامرین۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے معجزہ کی کچھ شرائط بیان کی ہیں، جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ معجزہ چیلنج کے طور پر اپنے مامور من اللہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ معجزہ مافوق الفطرت ہو۔ یہ دونوں شرطیں ان کتابوں میں مفقود ہیں۔ ہم نے اعجاز کی بحث کی ابتداء میں خاصی تفصیل سے ان شرائط کی وضاحت کی ہے۔

ایک اور شبہ یہ بیان کیا گیا ہے :

۷۔ اگر اہلِ عرب نے قرآن کی نظیر پیش نہیں کی تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ انسان ایسا کرنے سے قاصر ہے، بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کا اعجاز سے کوئی تعلق نہیں۔ زمانۂ نبوّت میں اور اس کے کچھ عرصے بعد تک تو عربوں نے اس لیے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی کہ وہ مسلمانوں کی طاقت اور اقتدار سے خوف زدہ تھے اور انھیں اپنی جان و مال کا اندیشہ لاحق تھا۔ خلفائے اربعہ کے بعد جب حکومت بنی امیہ کو مل گئی تو گو ان کی حکومت کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر نہیں تھی لیکن اس وقت تک قرآن کے الفاظ کی شگفتگی اور اس کے معانی کی پختگی کی وجہ سے طبیعتیں اس سے مانوس ہو چکی تھیں اور اس نے ایک موروثی سرمایہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس لیے کسی نے اس کے مقابلے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

جواب

اوّلاً یہ کہ جب قرآن نے چیلنج دیا تھا اور اس کی سورتوں

جیسی ایک ہی سورت مقابلے میں پیش کرنے کی دعوت دی تھی اس وقت نبی کریمؐ مکہّ میں تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کو شوکت و طاقت حاصل نہیں تھی اور مسلمانوں کا اقتدار ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود فصحائے عرب میں سے کوئی مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکا۔

ثانیاً یہ کہ خلفاء کے زمانے میں بھی جب اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا ان کا خوف کفار کو کفر کے اظہار اور اسلام کے انکار سے کبھی باز نہیں رکھ سکا۔ اہلِ کتاب جزیرہ نمائے عرب میں برابر چین اور آرام کی زندگی گزارتے رہے۔ ان کے حقوق اور فرائض وہی تھے جو مسلمانوں کے تھے۔ خصوصاً امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں کہ جن کے عدل و انصاف اور وفورِ علم کا اعتراف مسلمانوں اور غیر مسلموں سب نے کیا ہے۔ چنانچہ آزادیٔ اظہار کے اس دور میں اگر اہلِ کتاب یا غیر اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص قرآن کی نظیر پیش کرنے پر قادر ہوتا تو وہ اتمامِ حجت کے طور پر ضرور ایسا کرتا۔

ثالثاً یہ کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خلفاء کا خوف قرآن کے مقابلے پر آنے سے مانع تھا تو یہ خوف صرف کھلّم کھلّا مقابلے کی صورت میں ہوسکتا تھا۔ پھر اس بات میں کیا چیز مانع تھی کہ وہ اپنے گھروں اور اپنی نجی محفلوں میں قرآن کا مقابلہ کرتے اور اس کی نظیر تیار کرکے اس وقت کا انتظار کرتے۔ جب خوف دور ہو جاتا۔ آخر انھوں نے سخت سے سخت حالات میں بائبل کے

واہیات قصوں اور اپنے مذہب سے متعلق دوسری چیزوں کو بھی تو اسی طرح محفوظ رکھا تھا۔ لیکن ان کی طرف سے قرآن کی مثل لانے کی کسی خفیہ کوشش کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

رابعاً یہ کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ کوئی کلام کتنا ہی بلند پایہ اور بلیغ کیوں نہ ہو اگر بار بار کان میں پڑتا رہے تو اس کی وہ پہلی سی بات باقی نہیں رہتی۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فصیح و بلیغ نظمیں اگر بار بار دہرائی جائیں تو طبیعتیں ان سے اکتانے لگتی ہیں۔ اگر کوئی نئی نظم پڑھی جائے تو پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پرانی نظم سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر اگر پرانی نظم بھی پڑھی جائے تو ان دونوں کا حقیقی فرق واضح ہوجاتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا جو آدمی کو اچھی لگتی ہیں اور جن میں اسے لطف آتا ہے یہی قاعدہ ہے۔ وہ چیزیں چاہے کھانے کی ہوں یا پہننے کی یا سننے کی۔ اگر قرآن معجزہ نہ ہوتا تو اس قاعدہ کے مطابق وقت گزرنے کے ساتھ اور بار بار دہرائے جانے سے اس کی بھی قدر و منزلت کم ہوجانی چاہیے تھی اور اس سے طبیعتوں کو اکتا جانا چاہیے تھا۔ ان حالات میں اس کا مقابلہ کرنا آسان ہوجاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کثرت سے پڑھے جانے اور بار بار دہرائے جانے کے باوجود اس کے حسن اور اس کی رونق میں اضافہ ہی ہورہا ہے اور اب بھی اس کا ثمرہ عرفان و یقین اور ایمان و تصدیق ہی ہے۔ اس لیے یہ عام کلام کے مقابلے میں اس کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اس کے اعجاز کا ایک اہم پہلو ہے۔ لہذا قرآن کے متواتر پڑھے

جانے سے اس کے اعجاز کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ مخالفین کا خیال ہے۔
خامساً یہ کہ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ بار بار دہرائے جانے سے طبیعتیں مانوس ہو جاتی ہیں اور پھر مقابلہ کی کوشش نہیں کرتیں تو ایسا ان مسلمانوں کے ساتھ ہی ہوا ہو گا جو قرآن کو مانتے اور شوق و رغبت سے اس کی تلاوت سنتے ہیں۔ آخر غیر مسلم عرب فصحاء نے کیوں مقابلہ نہیں کیا؟ اگر وہ مقابلہ کرتے تو وہ غیر مسلموں میں ضرور مقبول اور مشہور ہوتا۔

ایک اور شبہ

۸۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ جب خلیفہ ابوبکر نے جمع قرآن کا ارادہ کیا تو انھوں نے عمر بن خطّاب اور زید بن ثابت کو مامور کیا کہ وہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جائیں اور دو گواہ جس آیت کے کلامُ اللہ ہونے کی گواہی دیں اسے لکھ لیں۔ اگر قرآن خارق العادات اور مافوق الفطرت کلام ہوتا تو کسی گواہ کی ضرورت نہیں تھی اور وہ خود ہی اپنی گواہی دیتا۔

جواب

اوّلاً یہ کہ قرآن اپنے طرزِ بیان اور بلاغتِ اسلوب کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کا ہر لفظ تو معجزہ نہیں، اس لیے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مبادا کوئی لفظ بدل گیا ہو یا کم یا زیادہ ہو گیا ہو۔ اگر گواہوں کی شہادت کا واقعہ صحیح ہے تو اس کا مقصد اسی احتمال کی پیش بندی ہو گا کہ کوئی قاری سہواً یا قصداً کوئی کمی بیشی

نہ کر دے۔ اس کے علاوہ کسی شخص کے کسی قرآنی سورت کی نظیر پیش نہ کر سکنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک آیت یا ایک آیت سے کچھ کم و بیش بھی نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اس امر کے محال ہونے کا مسلمانوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ قرآن ہی نے اپنے چیلنج میں یہ بات کہی ہے۔

ثانیاً یہ کہ وہ روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن خلیفہ ابوبکر کے عہد میں دو گواہوں کی شہادت سے جمع کیا گیا تھا وہ سب کی سب اخبارِ آحاد ہیں کہ جن کو اس طرح کے معاملات میں بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ثالثاً یہ روایات ان دوسری متعدد روایات سے متصادم ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن عہدِ نبوی ہی میں جمع ہو چکا تھا اور صحابہ کی خاصی تعداد کو پورا قرآن حفظ تھا۔ جن کو کچھ پارے یا سورتیں یاد تھیں ان کا تو شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ جن روایات کا مخالف نے حوالہ دیا ہے عقلِ سلیم بتلاتی ہے کہ وہ غلط ہیں کیونکہ قرآن جو مسلمانوں کی ہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور جس نے انھیں جہالت اور شقاوت کے اندھیروں سے نکال کر علم اور فوز و فلاح کی روشنی میں پہنچایا تھا۔ اس سے مسلمانوں کو بڑا شغف تھا، وہ دن رات اس کی تلاوت کرتے اور اس کو صحیح پڑھنے اور حفظ کرنے پر باہم فخر کرتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ بھی مسلمانوں کو ان باتوں کی ترغیب دیتے تھے۔ ان حالات میں کیا کوئی ذی عقل انسان یہ باور کر سکتا ہے کہ قرآن میں بھی کسی کو

کچھ شک ہوا ہوگا اور قرآن کو ثابت کرنے کے لیے بھی گواہوں کی ضرورت پڑی ہوگی ؟[1]

ایک شبہ یہ بیان کیا جاتا ہے :

۹ - قرآن کا اسلوب فصحاء کے معروف اسلوب سے مختلف ہے، قرآن کے ہر حصّہ میں مختلف موضوعات خلط ملط کر دیے گئے ہیں۔ تاریخ کی بات کرتے کرتے قرآن وعدہ و وعید یا حِکَم و امثال یا کسی اور کی بات شروع کر دیتا ہے۔ اگر ہر موضوع کی آیات قرآن میں یکجا ہوتیں تو اس کی ترتیب بھی درست ہوتی اور اس سے استفادہ بھی آسان ہوتا۔

جواب

قرآن انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اور دنیا و آخرت کی بھلائی کی طرف مخلوق کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ کوئی تاریخ، فقہ یا اخلاق وغیرہ کی کتاب نہیں کہ ہر موضوع کے لیے مستقل باب باندھا جائے۔ قرآن کا جو مقصد ہے اس کے لیے موجودہ ترتیب ہی مناسب ہے۔ قرآن کا قاری کم وقت میں اور تھوڑی سی محنت سے ایک ہی سورت پڑھ کر گوناگوں موضوعات پر قرآنی ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی توجہ

---

[1] مؤلف دام ظلّہ نے البیان میں جمع و تدوینِ قرآن کے باب میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قرآن عہد نبوی میں جمع ہو چکا تھا۔

مبدأ و معاد کی طرف بھی مبذول ہوجاتی ہے اور وہ گزشتہ ادوار کے قصّوں سے بھی عبرت حاصل کرسکتا ہے۔ عمدہ اخلاق اور معارفِ عالیہ سے بھی روشناس ہوجاتا ہے اور عبادات و معاملات کے کچھ احکام بھی سیکھ لیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کلام کا دروبست اس کا حسنِ بیان اور مقتضائے حال کی رعایت بھی ملحوظ رہتی ہے۔ اگر قرآن میں ہر مضمون کا علیحدہ باب ہوتا تو یہ فوائد حاصل نہ ہوسکتے۔ ایک قاری قرآن کے جملہ مضامین سے اس وقت تک آگاہی حاصل نہ کرسکتا تھا جب تک کہ پورا قرآن نہ پڑھ لے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن کی خوبی اور اس کا حُسن ہے۔ اس کے موضوع بدلتے رہتے ہیں لیکن ان میں ربط اور ہم آہنگی پوری طرح برقرار رہتی ہے۔ قرآن کا ہر جملہ ایک موتی ہے جسے ایک لڑی میں پرودیا گیا ہے لیکن اسلام سے بُغض نے اس معترض کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جس کی وجہ سے اُسے حُسن، بدصورتی اور خوبی، عیب نظر آتی ہے۔ قرآن نے اکثر ایک ہی قصّہ کو حسبِ ضرورت مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اگر ان سب عبارتوں کو ایک ہی باب میں جمع کردیا جائے تو تکرار سے جو فائدہ متصور ہے وہ باقی نہیں رہے گا اور پڑھنے والے کو غیر ضروری تکرار کا احساس ہوگا۔

قرآن پر اعتراضات

۱۹۱۲ء میں بولاق، مصر کے اینگلو امریکن پریس سے ایک

رسالہ حسن الإیجاز کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کے عیسائی مصنف نے رسالہ میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کی نظیر پیش کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اس نے چند جملے پیش کیے ہیں جو قرآن ہی سے ماخوذ ہیں اور محض الفاظ میں کچھ ردّو بدل کر دیا گیا ہے اس طرح بزعم خویش اس نے قرآن کا مقابلہ کیا ہے مگر حقیقت میں اپنے مبلغِ علم اور بلاغت سے واقفیت کی قلعی کھول دی ہے۔ ہم یہاں اس مصنف کے وہ جملے نقل کرتے ہیں اور اس کے اس خیالی مقابلے کی کمزوریاں واضح کرتے ہیں۔ ہم نے اس کتاب کے رد میں رسالہ نفحات الإعجاز لکھا ہے جو ۱۳۴۲ھ میں مطبعۃ العلویہ نجفِ اشرف سے شائع ہو چکا ہے۔

اس خیال باف مصنّف نے سورۂ فاتحہ کے مقابلے میں یہ عبارت پیش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کے تمام معانی پر بھی حاوی ہے اور اس سے مختصر بھی:

الحمد للرحمٰن ۔ ربّ الأکوان ۔ الملك الدیّان ۔ لك العبادۃ و بك المستعان ۔ إهدنا صراط الإیمان ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عبارت کے مصنف کے بارے میں کیا کہا جائے جبکہ اسے بلند و پست کلام میں فرق کرنے کی تمیز ہی نہیں۔ کاش وہ اپنی رسوائی کا سامان کرنے سے پہلے یہ عبارت ان عیسائی ادیبوں ہی کو دکھا لیتا جو عربی زبان کے اسالیب اور فنونِ بلاغت سے واقف ہیں۔ کیا اسے یہ بھی

احساس نہیں کہ کلام کا مقابلہ کرنے اور اس کی نظیر پیش کرنے کا معروف طریقہ یہ ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر ایسا کلام پیش کرے جس میں کچھ خصوصیات اس کلام کی ہوں جس کا مقابلہ مقصود ہے، اس کا موضوع بھی وہی ہو جو اس کلام کا ہے کہ جس کا مقابلہ کرنا مقصود ہے مگر اسلوب، الفاظ اور تراکیب جُداگانہ ہوں۔ مقابلہ کے یہ معنیٰ نہیں کہ صرف کچھ الفاظ بدل دیئے جائیں ورنہ اس طرح تو ہر کلام کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام تو نبی اکرمؐ کے ہمعصر عربوں کے لیے اور بھی آسان تھا مگر وہ مقابلے کے صحیح مفہوم سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ قرآن میں بلاغت کی بنیاد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مقابلہ نہ کر پائے اور انھوں نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا۔ پھر کچھ ایمان لے آئے اور کچھ نے ماننے سے انکار کر دیا۔

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ.

پس کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے جو کہیں سے لیا گیا ہے۔ (سورۂ مدثّر۔ آیت ۲۴)

اب یہ دیکھیے کہ جو جملے اس مصنّف نے کوشش کر کے بنائے ہیں کیا ان کا موازنہ سورۂ فاتحہ سے کرنا درست ہے، کیا ان جملوں میں سورۂ فاتحہ کے معنیٰ پوری طرح ادا ہو گئے؟ کیا اس مصنّف کے لیے ضروری تھا کہ وہ اصولِ بلاغت سے اپنی ناواقفیت کا سب لوگوں کے سامنے ڈھنڈورا پیٹتا؟ اس نے کہا ہے اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰن ۔ کیا اس فقرے کا موازنہ اللہ کے

فرماتے ہوئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے ہوسکتا ہے؟

اِس جملہ میں اللہ کے کلام کا اصل مقصد ادا ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ لفظ اَللّٰہ اسم عَلَم ہے اس ذاتِ مقدس کا جو جامع ہے تمام صفاتِ کمال کی۔ صفاتِ کمال میں سے ایک صِفَت رحمت ہے جس کی طرف بِسْمِ اللّٰہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اَلرَّحْمٰن کا لفظ لانے سے باقی تمام صفاتِ کمال جو اللہ کی ذات میں جمع ہیں اور جس کی بنا پر وہ ذاتِ پاک گونا گوں لحاظ سے حمد کی مستحق ہے نظرانداز ہوگئیں۔

اسی طرح رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ ربّ الاَکوان سے بدل دیئے گئے ہیں۔ یہاں بھی ان دو آیتوں کا مطلب پورا ادا نہیں ہوسکا۔ یہ آیتیں ظاہر کرتی تھیں کہ طول وعرض میں متعدد عالَم ہیں، اللہ ان سب جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے اس کی رحمت ان سب جہانوں کو شامل ہے۔ لفظ رحیم میں اس طرف اشارہ تھا کہ اس کی رحمت مسلسل اور بغیر کسی وقفہ کے برابر جاری ہے۔

یہ سب معانی ربّ الاَکوان سے ادا نہیں ہوسکتے۔ کون کے معنیٰ ہیں ہونا۔ ہوجانا۔ واقع ہوجانا۔ یہ سب مصدری معنیٰ ہیں۔ اِس لیے لفظ رَبّ کی کون کی طرف اضافت بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ رب کے معنیٰ ہیں مالک، مربّی۔ البتہ خالق کی اضافت کوْن اور اس کی جمع اَکوَان کی طرف درست ہے۔ اِس لیے لفظ اَکوَان سے مختلف جہانوں کا وجود اس طرح ظاہر نہیں ہوتا

جیسے عَالِمِیْن سے اور نہ آیت کے پُورے معنیٰ ادا ہوتے ہیں۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو الملك الديان سے بدلنے کی بھی یہی صُورت ہے۔ الملك الديان سے ایک دوسری دُنیا کا وجود ظاہر نہیں ہوتا جہاں اعمال کی سزا و جزا دی جائے گی اور نہ یہ کہ اس دن کا مالک اللہ ہی ہوگا اور کسی کو کسی طرح کے تصرّف کا اختیار نہیں ہوگا۔ اس دن سب اللہ کے حکم کے تابع ہوں گے وہ جس کے ساتھ جو چاہے گا کرے گا۔ وہ کچھ کو جنّت میں بھیجے گا اور کچھ کو دوزخ میں۔ الملك الديان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے اور اعمال کی جزا دیتا ہے، اِس جملے کے معنیٰ میں اور آیت کے معنی میں بڑا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ.
اِس رسالہ کا مصنف یہ سمجھا کہ مطلب یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے اور مدد صرف وہی کر سکتا ہے۔ اس لیے اس نے قرآنی الفاظ کی جگہ یہ لفظ رکھ دیئے:

لك العبادة وبك المستعان

وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ آیت کا مقصد مومن کو یہ سکھانا ہے کہ وہ عبادت کے ذریعے اپنے عقیدۂ توحید کا اظہار کرے اور یہ اعتراف کرے کہ وہ اپنی عبادات اور تمام اعمال میں اللہ کی اعانت اور مدد کا محتاج ہے اور اس کا بھی اقرار کرے کہ وہ اور تمام مؤمنین اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور اللہ کے سوا کسی سے مدد طلب نہیں کرتے۔ اب یہ دیکھیے کہ اس رسالے کے مصنّف کی عبارت سے

یہ مطلب کہاں ادا ہوتا ہے، مزید برآں یہ عبارت آیتِ قرآنی کے مقابلے میں مختصر بھی نہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ.

اس آیت میں ہدایت طلب کی گئی ہے، ان عقائد، اعمال اور عادتوں کی جن کے ذریعے سے انسان بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ یہ ذریعہ صرف ایمان تک محدود نہیں ہے اس لیے اهدنا صراط الایمان کہنا کافی نہیں۔ مزید یہ کہ اس جملے میں صرف ایمان کے راستے کی طرف ہدایت طلب کی گئی ہے۔ اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کہ یہ راہِ راست ہے جس پر چلنے والا کبھی نہیں بھٹکتا۔

انھیں جملوں پر اکتفا کر کے حسن الإیجاز کے مصنّف نے یہ سمجھ لیا کہ سورۂ فاتحہ کے باقی حصّے کی کوئی ضرورت نہیں جو اس کی کوتاہیٔ فہم کا ثبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا
الضَّآلِّيْنَ.

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ دو راستے موجود ہیں، ایک تو وہ صراطِ مستقیم جس پر انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین چلتے ہیں جن پر اللہ کا خاص انعام ہے اور دوسرا راستہ صراطِ غیر مستقیم ہے جس پر وہ لوگ چلتے ہیں جو حق کے مخالف ہیں اور

جو حق واضح ہو جانے پر بھی اس انکار کرتے ہیں، جو اپنی کم فہمی اور تلاشِ حق میں کوتاہی کے باعث راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں، جو اپنے باپ دادا کے طریقے پر چل کر خوش ہیں اور اپنے آباء واجداد کی بلا دلیل اور حکم الہٰی کے خلاف پیروی کرتے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کا غضب ہے۔

جب کوئی شخص اس آیتِ مبارکہ کو پڑھتا اور اس کے معانی پر غور کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اعمال، اخلاق اور عقائد میں خاصان خدا کی پیروی کرے اور ان متمرّدین کے طریقوں سے بچے جن پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو راہِ حق واضح ہو جانے کے بعد اس سے بھٹک گئے۔ جیسا کہ یہ مصنّف خیال کرتا ہے، کیا یہ باتیں غیر اہم ہیں؟

سورۂ کوثر کے مقابلے میں اس شخص نے یہ عبارت پیش کی ہے:

إنّا أعطيناك الجواهر. فصلّ لربّك
وجاهر. ولا تعتمد قول ساحر.

ذرا غور کیجیے! یہ شخص کس قدر قرآن کے در و بست اور اس کے کلمات کی نقل اتارتا ہے اور بعض بعض الفاظ بدل کر لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ میں نے قرآن کا مقابلہ کر لیا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس نے کس دیدہ دلیری سے مسیلمہ کذّاب کے الفاظ کا سرقہ کیا ہے، جس نے یہ عبارت پیش کی تھی:

إنا اعطیناك الجماهر. فصلّ لربّك وجاهر. وإن مبغضك رجل كافر.

تعجّب تو یہ ہے کہ اس شخص کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ دو کلام محض سجع کی مشابہت سے فصاحت و بلاغت میں بھی ہم مرتبہ ہوسکتے ہیں؟ اس نے یہ نہ سوچا کہ جواہر ملنے کا اقامتِ صلاۃ اور اس کے اعلان سے کیا تعلّق ہے؟ اللہ نے انسان کو اور بھی بڑی نعمتیں دی ہیں جن کا درجہ مال و دولت سے کہیں زیادہ ہے، جیسے زندگی، عقل اور ایمان۔ ان نعمتوں کو چھوڑ کر محض دولت کی وجہ سے نماز کا حکم کیسے درست ہوسکتا ہے؟ لیکن جو دولت کے لالچ میں مشنری بنتے ہیں ظاہر ہے ان کا قبلہ تو دولت ہی ہوگا اور دولت کا حصول ہی ان کی زندگی کا مقصد ہوگا۔ اس کو وہ ہر چیز پر مقدّم سمجھیں گے۔

از آبگینہ می تراود ہرچہ دروست

اس مصنّف سے یہ پوچھنا چاہیے کہ لفظ جواہر سے اس کی کیا مراد ہے؟ اس لفظ کو وہ الف لام کے ساتھ لایا ہے۔ اگر کوئی خاص جوہر مراد ہیں تو اس عبارت میں کوئی ایسا قرینہ نہیں جس سے ان جواہر کا تعیّن ہوسکے۔ اگر الف لام استغراق کے لیے ہے اور جواہر سے مراد دنیا کے تمام جواہر ہیں تو یہ بالکل جھوٹ اور لغو بات ہے۔ اس کے علاوہ اول کے دو جملوں اور لا تعتمد قول ساحر میں کیا مناسبت ہے؟ ساحر سے کون مراد ہے اور اس کے کس قول پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا؟ اگر

کوئی خاص ساحر اور اس کا کوئی خاص قول مراد ہے تو اس کے لیے عبارت میں کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر ہر ساحر کا ہر قول مراد ہے کیونکہ ساحر اور قول نکرہ استعمال ہوئے ہیں تو پھر یہ کلام لغو ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ کسی ساحر یا جادوگر کے کسی بھی قول کا اعتبار نہ کیا جائے۔ چاہے وہ روزمرّہ کی بات ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اس کی بات پر اطمینان ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یہ مطلب ہے کہ اس بات پر بھروسہ نہ کیا جائے جو وہ جادوگر کی حیثیت سے کہے تو یہ بھی غلط ہے، اس لیے کہ جادوگر کہتا کچھ نہیں وہ تو جادو کرتا ہے اور اپنی چالوں اور کارستانیوں سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

سورۂ کوثر رسول اللہؐ کے ان دشمنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حقارت سے کہتے تھے کہ وہ تو بے نام و نشان ہے اور عنقریب مر جائے گا، پھر نہ اس کا دین رہے گا، نہ اس کا نام۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اِس طرف اشارہ ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ.

کیا یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہیں اور ہم ان کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

(سورۂ طور۔ آیت ۳۰)

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ.

کوثر سے مراد وہ خیر کثیر ہے جو ہر لحاظ سے خیر ہی خیر ہو، دُنیا میں نبوت اور مخلوق کی ہدایت کا شرف، مسلمانوں کی سربراہی، حامیوں کی کثرت، دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی، اپنی جگر پارہ صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے سلسلے سے کثیر اولاد جس سے آپ کا نام تاقیام قیامت چلے گا۔ اسی طرح آخرت میں شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود، بہشت بریں اور حوضِ کوثر جس سے صرف آپؐ اور آپؐ کے دوست ہی سیراب ہوں گے، ان کے علاوہ اور بہت سی نعمتیں ہیں جو اللہ نے آپؐ کو عطا کیں۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ.

ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز اور نحر کا حکم دیا گیا ہے۔ نحر سے مراد منیٰ میں اونٹ کی قربانی بھی ہوسکتی اور عیدالاضحیٰ کی قربانی بھی۔ نماز کی تکبیر میں گوش و گردن تک ہاتھ اٹھانا یا استقبالِ قبلہ میں مُنہ قبلہ کی طرف رکھنا اور حالتِ قیام میں تمام اعضاء کا معتدل رکھنا بھی مُراد ہوسکتا ہے۔ یہ سب معانی اس مقام کے لیے مناسب ہیں کیونکہ یہ سب شکر کی صورتیں ہیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ.

تمھارا دشمن ہی بے نسل ہے۔

ان نظرِ حقارت سے دیکھنے والے دشمنوں کا وہی انجام ہوا جس کی اللہ نے خبر دی تھی۔ ان کو آج دُنیا میں بھلائی سے یاد کرنے والا کوئی نہیں۔ آخرت میں تو دردناک عذاب اور دائمی ذلّت ان کا مقدّر ہے ہی۔ کیا اس سورت کے بلند معانی اور اس

کی بھرپور بلاغت کا کوئی موازنہ ان گرے ہوئے جملوں کے ساتھ ہوسکتا ہے جن میں اس مصنّف نے قرآن کی ناکام نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر بھی اُسلوب اور الفاظ مُسَیلَمَہ کذّاب کے چُرا لایا اور محض اپنی جہالت اور عناد کی بنا پر قرآن کی عظمت، اس کی بلاغت اور اس کے اعجاز کے مُنہ آیا ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیگر معجزات

کسی باخبر محقّق کو اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآنِ کریم ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انبیاء ورسلؑ کے سب معجزات میں قرآن عظیم ترین معجزہ ہے۔ ہم نے گزشتہ مباحث میں اس کے اعجاز کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور کتابُ اللہ کی دوسرے معجزات پر برتری کی وضاحت کی ہے۔

اب ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ کا معجزہ صرف قرآن ہی نہیں ہے۔ جو معجزات دوسرے انبیاءؑ نے دکھائے ہیں وہ آپؐ نے بھی دکھائے ہیں۔ کتابُ اللہ کا معجزہ البتہ ایسا ہے جو صرف آپؐ سے مخصوص ہے۔ ہماری اس بات کی دو دلیلیں

ہیں :-

پہلی تو یہ کہ آپؐ کے معجزات کے بارے میں مسلمانوں کے پاس متواتر احادیث و اخبار موجود ہیں اور مختلف فرقوں کے مسلمانوں نے آپؐ کے معجزات کے موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی ہیں جن کا ہر شخص مطالعہ کر سکتا ہے ۔ رسول اکرمؐ کے معجزات کی خبروں کو اہل کتاب کے انبیاءؑ کے معجزات کی خبروں پر دو وجہ سے فوقیت حاصل ہے :-

۱۔ قربِ زمانی : اگر کسی واقعہ کو تھوڑا عرصہ گزرا ہو تو اس کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنا آسان ہے بمقابلہ کسی ایسے واقعہ کے جس کو مدتیں گزر چکی ہوں۔

۲۔ کثرتِ روایات : نبی اکرمؐ کے جن اصحاب نے ان معجزات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کی تعداد ان بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں سے جنھوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات نقل کیے ہیں ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ پر ان کی زندگی میں ایمان لانے والوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ ان کے جو معجزات منقول ہیں ظاہر ہے کہ ان کی روایت کا سلسلہ آخر میں انھی مٹھی بھر مؤمنین تک پہنچتا ہو گا۔

اگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کے
بارے میں تواتر کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے تو پھر پیغمبر
اسلامؐ کے معجزات کے بارے میں تواتر کا دعویٰ
بطریقِ اولیٰ صحیح ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے انبیائے سابقین
کے بہت سے معجزات کی تصدیق کی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ آپؐ
ان تمام انبیاءؑ سے افضل اور خاتم النبیّین ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ
ہوئے کہ جو معجزات پچھلے انبیاءؑ نے دکھائے آپؐ نے ضرور اسی
طرح کے معجزات کو زیادہ بہتر طریقے پر دکھلایا ہے ورنہ یہ بات عقل
میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے افضل ہونے کا دعویٰ
بھی کرے اور خود ہی یہ بھی اعتراف کرے کہ بعض صفاتِ کمالیہ
میں وہ اس سے کمتر ہے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی
شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ سب سے بڑا طبیب ہے اور ساتھ
ہی یہ بھی اعتراف کرے کہ کوئی بیماری ایسی ہے جس کا وہ تو
علاج نہیں کرسکتا لیکن بعض دوسرے اطبّاء علاج کرسکتے ہیں؟
عقل کہتی ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم
دیکھتے ہیں کہ بعض جھوٹے مدّعیانِ نبوّت نے معجزے کا انکار کیا ہے،
وہ یہ نہیں مانتے کہ انبیائے سابقینؑ نے کوئی معجزہ دکھایا ہے،
اس ڈر سے کہ کہیں لوگ ان سے معجزہ دکھانے کا مطالبہ نہ کرنے
لگیں اور ان کی بے بسی کا بھانڈا پھوٹ جائے۔ انھوں نے ہر
اس آیت کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جس میں کسی معجزے کا

ذکر تھا۔

بعض جاہل اشخاص نے جو سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں، یہ بھی لکھا ہے کہ خود آیاتِ قرآنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کا قرآن کے سوا اور کوئی معجزہ نہیں تھا، یہی ایک معجزہ آپؐ کی نبوّت کی دلیل تھا۔ ہم ذیل میں وہ آیات نقل کرتے ہیں جن کو ان لوگوں نے بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔ پھر اُن کا طریقہ استدلال بیان کرنے کے بعد ہم اس کی خرابی واضح کریں گے۔

ان آیات میں سے ایک یہ ہے :

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا.

ہم کو خاص نشانیاں بھیجنے سے یہی امر مانع ہوا کہ پہلے زمانے کے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں اور ہم نے قومِ ثمود کو اونٹنی دی تھی جو بصیرت کا ذریعہ تھی مگر ان لوگوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم ایسی نشانیاں صرف ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۵۹)

ان لوگوں کے خیال کے مطابق اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا قرآن کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں تھا اور آنحضرتؐ کو دُوسرے معجزات نہ دیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی قوموں نے ان نشانیوں کی تکذیب کی تھی جو اُن کو بھیجی گئی تھیں۔

جواب

اِس آیتِ کریمہ میں جن نشانیوں کی نفی کی گئی ہے اور جن کی پہلی قوموں نے تکذیب کی تھی، ان سے مراد وہ معجزات ہیں جن کی ان قوموں نے اپنے انبیاء ؑ سے فرمائش کی تھی، لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسولِ اکرم ؐ نے وہ معجزات دکھانے منظور نہیں کیے جن کی آپؐ سے فرمائش کی گئی تھی۔ آیت میں مطلق معجزہ کی نفی نہیں بلکہ فرمائشی معجزوں کی نفی ہے، جس کا ثبوت حسبِ ذیل امور سے ملتا ہے :-

۱۔ یہاں معجزات کے لیے "آیات" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو "آیت" کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں علامات یا نشانی۔ چونکہ اس لفظ پر الف لام داخل ہے یعنی اَلْآیَات کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لیے اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں :

اَلْآیَات سے مراد ہر وہ نشانی ہو جس پر نشانی کا لفظ صادق آسکے۔ اِس صورت میں ہر اس نشانی کی نفی ہوگی جو مدّعیٔ نبوّت کی صداقت کی دلیل ہوسکے۔ اس صورت میں رسول کی بعثت ہی بیکار ہوجائے گی کیونکہ اس کی صداقت کی کوئی دلیل ہی نہیں ہوگی۔ پھر اس کی بعثت سے کیا فائدہ ؟ لوگوں کو رسول پر ایمان لانے اور اس کے اتباع کا مکلّف ٹھہرانے کا مطلب ان پر ایسی ذمّہ داری ڈالنا ہوگا جو ان کی طاقت سے باہر ہے۔

اَلْآیَات کا دُوسرا مطلب ہوسکتا ہے "سب نشانیاں"۔

یہ بھی بے معنیٰ بات ہے۔ اس لیے کہ نبی کی صداقت کے لیے ایک ہی نشانی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے تمام نشانیاں یا معجزات دیے جائیں۔ نہ فرمائش کرنے والوں نے کبھی کسی نبی سے یہ فرمائش کی ہے کہ وہ سب کے سب معجزات دکھائے۔

"الآیات" کا تیسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن نے رسولِ اکرمؐ سے جن معجزوں کی نفی کی ہے وہ ایسے معجزے ہیں کہ جن کی فرمائش مشرکوں کی طرف سے کی جاتی تھی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ کو معجزات اس لیے نہ دیے گئے ہوتے کہ لوگوں نے گزشتہ انبیاءؑ کے معجزوں کی تکذیب کی تھی تو قرآن بھی نازل نہ کیا جاتا کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ تکذیب کی وجہ سے صرف دُوسرے معجزات ہی کو روک دیا جاتا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انبیاءؑ کو جو معجزات عطا کیے گئے ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے تحدّی کے ساتھ تمام اقوامِ عالم کے سامنے پیش کیا ہے اور تا قیامِ قیامت ان کا چیلنج برقرار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن معجزات کے دیے جانے سے انکار کیا گیا ہے وہ کچھ مخصوص قسم کے معجزات ہیں، سب معجزات نہیں۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ آیت میں تصریح ہے کہ اب ایسے معجزات کے نہ دیے جانے کا سبب یہ ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی تھی۔ گویا کہ ایک چیز کے نہ ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود ہے اور رکاوٹ کی توجیہ اسی وقت

درست ہوسکتی ہے جب ایسے حالات موجود ہوں جن میں اس چیز کا وجود ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آگ ہی موجود نہ ہو تو کوئی معقول آدمی یہ نہیں کہے گا کہ لکڑی اس لیے نہیں جلتی کیونکہ وہ گیلی ہے یہ ایسی بات ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لیے جب یہ کہا گیا کہ معجزات اس لیے نہیں دیئے گئے کیونکہ پہلے لوگوں نے ان کی تکذیب کی تھی تو ایسے حالات موجود ہونے ضروری ہیں جن میں معجزات کی ضرورت ہو تاکہ ان کے نہ ہونے کی توجیہ صحیح ہو اور یہ ظاہر ہے کہ معجزات کی ضرورت اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت دے اور ان کی اس راستے کی طرف رہنمائی کرے جس میں ان کی صلاح وفلاح ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ فرمائشی معجزات ان معجزات سے ایک زائد چیز ہیں جو اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہیں۔ اب اگر معجزات کے ظہور کا سبب حکمتِ الٰہی ہے تو پھر معجزات کا دیا جانا بھی ضروری ہے۔ کوئی چیز حکمتِ الٰہی کو اپنے عمل سے نہیں روک سکتی اور یہ محال ہے کہ حکیمِ مطلق عملاً کوئی ایسی صورت اختیار کرے جو اس کی حکمت کے تقاضے کے منافی ہو۔ تکذیب ہونے یا نہ ہونے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پچھلی اُمّتوں کی تکذیب معجزات کے بارے میں حکمتِ الٰہی کے اثر میں مانع ہوسکتی ہے تو پھر یہ تکذیب رسولؐ کی بعثت میں بھی مانع ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات لغو اور مسلّمہ حقیقت

کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ طے ہوگیا کہ یہاں جن معجزات کا ذکر ہے وہ صرف وہ معجزات ہیں جو اس لیے دکھائے جاتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے فرمائش کی تھی اور یہ لوگ ان معجزات کے علاوہ جو اتمامِ حجّت کے لیے درکار تھے، کچھ اور معجزات کی فرمائش کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ان معجزات کا تو نبی کو عطا کرنا ضروری ہے جو اس کی نبوّت کے ثبوت کے لیے لازمی ہوں، لیکن اس سے زیادہ معجزات کا عطا کرنا نہ ابتداءً ضروری ہے نہ کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے۔ ہاں اگر اس کی مصلحت ہو تو اس کے لیے دوبارہ اور سہ بارہ بھی حجّت قائم کرنا ناممکن نہیں اور اگر وہ چاہے تو کوئی فرمائش بھی پوری کرسکتا ہے۔

عموماً لوگ فرمائشیں اُسی وقت کرتے ہیں جب ضروری معجزات کے ذریعے ان پر حُجّت قائم ہوچکی ہوتی ہے اور وہ ان معجزات کو جھٹلا چکے ہوتے ہیں۔ پہلی قوموں کی تکذیب کی وجہ سے اس امّت کو جو فرمائشی معجزات نہیں دیئے گئے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرمائشی معجزات کی تکذیب کے بعد جھٹلانے والوں پر عذاب کا آنا ضروری ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے اعزاز واکرام میں اس کی ضمانت دی ہے کہ ان کی امّت پر دنیوی عذاب نہیں آئے گا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ.

اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ آپؐ کے ہوتے ہوئے
ان پر عذاب نازل کرے۔ (سورۂ انفال - آیت ۳۳)

رہا فرمائشی معجزات کی تکذیب پر عذاب کا سوال — تو صورت یہ ہے کہ

اگر معجزہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کی نبوّت ثابت کرنے کے لیے ہے تو اس کی تکذیب پر تو وہی آخرت کی سزا ہوگی جو نبی کی تکذیب پر ہوتی ہے۔

لیکن فرمائشی معجزہ کی صورت مختلف ہے۔ فرمائش سے ضد اور عناد کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ اگر فرمائش کرنے والا طالبِ حق ہوتا تو وہ ان معجزات پر جو پہلے دکھائے جا چکے ہیں اور جو نبوّت کے ثبوت کے لیے کافی تھے ان پر ایمان لے آتا۔ اب جو اس نے فرمائش کی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا ہے کہ اگر اس کا تجویز کردہ معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ لازماً نبی کی تصدیق کرے گا۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ معجزہ دکھائے جانے پر بھی تکذیب کرتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ وہ نبی اور ان کی دعوت کے ساتھ تمسخر کرتا ہے اور اس کی فرمائش محض مذاق تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ ہم ایسے معجزات صرف ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں ورنہ عام معجزات صرف ڈرانے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ بعض معجزات از راہِ لطف و کرم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہوتے ہیں۔

اگر ہم اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کریں تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جن معجزات کو دکھانے سے انکار کیا گیا ہے وہ وہی معجزات ہیں جن کا ظہور بطور سزا کے یا ڈرانے کے لیے

ہوتا ہے۔ اِس سے پہلی آیت میں ہے:

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا. كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا.

ایسی کوئی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اس کو سخت عذاب نہ دیں۔ یہ کتاب (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۵۸)

اس کے بعد ثمود کے اس معجزے کا ذکر ہے جس کے بعد عذاب نازل ہوا۔ ثمود کا پورا قصّہ سورۂ شعراء میں ہے۔ اس آیت کے آخر میں کہا گیا ہے:

وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيَاتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا.

اور ہم ایسے معجزات صرف ڈرانے کے لیے بھیجا کرتے ہیں۔

ان تمام قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممنوع معجزات وہی فرمائشی معجزات ہیں جن کے نتیجہ میں عذاب آتا ہے۔

قرآنی آیات میں غور کرنے سے اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ مشرکین یا تو عذاب کی فرمائش کرتے تھے یا ایسے معجزات کی جن کی تکذیب پر پہلی اُمتوں پر عذاب آچکا تھا۔

پہلی قسم اِن آیات سے ظاہر ہے:

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ

مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ.

جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) واقعی تیری طرف سے ہے تو ہم پر پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب نازل کر دے۔ (سورۂ انفال-آیت ۳۲)

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ.

اور اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ان پر عذاب نازل کردے اور نہ ان کو اس حالت میں عذاب دے گا کہ وہ استغفار کرتے رہتے ہوں۔

(سورۂ انفال-آیت ۳۳)

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ.

یہ بتلاؤ کہ اگر تم پر عذابِ الٰہی رات کو یا دن کو آپڑے تو اس میں ایسی کیا بات ہے جس کی یہ مجرم لوگ جلدی کر رہے ہیں۔ (سورۂ یونس-آیت ۵۰)

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ.

اگر ہم تھوڑی مدّت تک ان کے عذاب کو مؤخّر کرتے ہیں تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس (عذاب) کو کیا چیز روک رہی ہے؟ (سورۂ ہود-آیت ۸)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ.

اور یہ لوگ آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں۔ اگر عذاب کا (علمِ الٰہی میں) وقت مقرر نہ ہوتا، تو ان پر آچکا ہوتا۔ ضرور ان پر اچانک عذاب آجائے گا اور انھیں خبر بھی نہیں ہوگی۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۵۳)

دوسری قسم کی بعض آیات حسبِ ذیل ہیں :-

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ.

جب کوئی نشانی ان کے پاس آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جیسی اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ کسے اپنی رسالت کا حامل قرار دے۔ جن لوگوں نے جرم کیا ہے عنقریب ان کو خدا کے یہاں سے سخت ذلت پہنچے گی اور ان کی شرارتوں کی سخت سزا ملے گی۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۲۴)

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ.

(اگر یہ واقعی رسول ہیں) تو ان کو چاہیے کہ کوئی

ایسی نشانی ہمارے پاس لائیں جیسی (نشانی دے کر) پہلے رسول بھیجے گئے تھے۔ (سورۂ انبیاء - آیت ۵)

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ . أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ . قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ .

جب ہماری طرف سے ان کو امر حق پہنچا تو کہنے لگے کہ ان کو ایسی چیز کیوں نہ دی گئی جیسی موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔ کیا اس سے قبل انھوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا تھا جو موسیٰؑ کو دی گئی تھی۔ یہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے موافق ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم کسی ایک کو بھی نہیں مانتے۔

(سورۂ قصص - آیت ۴۸)

مندرجۂ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لوگ فرمائشی معجزات ہی کی تکذیب پر عذاب کے مستحق قرار پائے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ .

جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انھوں نے بڑی تدبیریں کیں مگر اللہ نے ان کی بنائی ہوئی عمارت بنیاد سے ڈھادی۔ پھر اُوپر سے ان پر چھت آپڑی اور ان پر

عذاب اس طرح آیا کہ ان کے سان و گمان میں بھی نہ
تھا۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۲۶)

کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَاَتَاھُمُ الْعَذَابُ
مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ.

ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں انھوں نے بھی
تکذیب کی تھی چنانچہ ان پر عذاب اس طرح آیا کہ ان کو
خیال بھی نہ تھا۔ (سورۂ زمر۔ آیت ۲۵)

کتابُ اللہ میں اس طرح کے شواہد بہت ہیں اور اہل تشیّع
اور اہلِ سُنّت کی کتبِ تفسیر میں ان آیات کے جو معنی بیان کیے
گئے ہیں ان سے بھی اسی مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے
ان آیات کے الفاظ سے اخذ کیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ)
سَاَلَہٗ قَوْمُہٗ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ فَنَزَلَ جِبْرِیْلُ
وَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ یَقُوْلُ وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ
بِالْاٰیَاتِ اِلَّا اَنْ کَذَّبَ بِھَا الْاَوَّلُوْنَ. وَکُنَّا
اِذَا اَرْسَلْنَا اِلٰی قُرَیْشٍ اٰیَةً فَلَمْ یُؤْمِنُوْا بِھَا
اَھْلَکْنَاھُمْ، فَلِذٰلِكَ اَخَّرْنَا عَنْ قَوْمِكَ
الْاٰیَاتِ.

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؐ کی
قوم نے کسی معجزہ کی فرمائش کی۔ اِس پر جبرئیلؑ آئے

اور انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم کو خاص نشانیاں بھیجنے سے یہی امر مانع ہوا کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں" اگر کوئی نشانی قریش کے پاس بھیجی جاتی اور وہ ایمان نہ لاتے تو ہلاک کر دیے جاتے۔ اس لیے ہم نے آپ کی قوم کے پاس نشانیاں بھیجنا مؤخر کر دیا۔ [1]

ابنِ عباس روایت کرتے ہیں کہ

سَاَلَ اَهْلُ مَكَّةَ النَّبِيَّ ؐ اَنْ يَّجْعَلَ لَهُمُ الصَّفَا ذَهَبًا وَاَنْ يُّنَحِّيَ عَنْهُمُ الْجِبَالَ فَيَزْرَعُوْا فَقِيْلَ لَهٗ اِنْ شِئْتَ اَنْ نَّسْتَاْنِيَ بِهِمْ لَعَلَّنَا نَجْتَبِيْ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ نُّؤْتِيَهُمُ الَّذِيْ سَاَلُوْا فَاِنْ كَفَرُوْا اُهْلِكُوْا كَمَا اُهْلِكَ مَنْ قَبْلَهُمْ قَالَ بَلْ تَسْتَاْنِيْ بِهِمْ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيَاتِ...

اہلِ مکہ نے نبی اکرمؐ سے فرمائش کی صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیجیے اور پہاڑوں کو پیچھے دھکیل دیجیے تاکہ ہم کاشت کر سکیں۔ اس پر آپؐ سے کہا گیا کہ اگر آپؐ چاہیں تو ہم ٹھیر جائیں شاید ہم ان میں سے کچھ کو چن لیں اور اگر آپؐ چاہیں

---

[1] تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۶۰۷

تو ہم ان کی خواہش پوری کر دیں لیکن اگر اس کے بعد انھوں نے انکار کیا تو اسی طرح ہلاک ہو جائیں گے جیسے ان سے پہلے کے لوگ ہلاک ہوئے۔
ہم کو خاص معجزات بھیجنے سے یہی امر مانع ہوا۔۔۔۔[1]

ایسی اور بھی روایات ہیں جو کتب حدیث اور تفسیر طبری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جن آیات سے مخالفین نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نبی اکرمؐ کا قرآن کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوعًا. اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيلًا. اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.

مشرکین کہتے ہیں کہ ہم آپؐ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپؐ ہمارے لیے زمین سے کوئی

---

[1] تفسیر طبری جلد ۱۵ صفحہ ۷۴

چشمہ نہ جاری کردیں یا خاص آپؐ کے لیے کھجور اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو اور پھر اس باغ کے بیچ میں جگہ جگہ آپؐ نہریں نہ جاری کردیں یا جیسا کہ آپؐ کہا کرتے ہیں آپؐ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرادیں یا آپؐ اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لاکھڑا نہ کردیں یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپؐ آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور ہم آپؐ کے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک آپؐ ہمارے پاس ایک نوشتہ نہ لائیں جس کو ہم پڑھ لیں۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار پاک و منزّہ ہے۔ میں بجز آدمی اور پیغمبر کے کیا ہوں؟ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیات ۹۰ تا ۹۳)

مخالفین کا استدلال یہ ہے کہ مشرکین نے رسول اللہؐ کو اپنی نبوّت کی صداقت ثابت کرنے کے لیے معجزہ دکھانے کی دعوت دی۔ لیکن آپؐ نے اس سے معذوری ظاہر کی اور یہ اعتراف کرلیا کہ میں تو محض انسان ہوں جس کو تمھارے پاس بھیجا گیا ہے، لہٰذا ان آیات سے معلوم ہوا کہ آپ سے کسی معجزے کا صدور نہیں ہوا۔

جواب

ہم فرمائشی معجزات کی صورتِ حال پچھلے استدلال کے جواب میں واضح کرچکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن معجزات کے دکھانے کا مشرکین نے رسولِ خداؐ سے مطالبہ کیا تھا وہ فرمائشی

معجزات ہی تھے۔ دو باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مشرکین قبولِ حق کے لیے تیار نہ تھے :-

۱۔ انھوں نے آنحضرتؐ کی نبوّت کی تصدیق ان معجزات کے دکھانے کے ساتھ مشروط کی تھی۔ اگر وہ حق قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے تو ان فرمائشی معجزات کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ کوئی بھی معجزہ آپؐ کی نبوّت کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔

۲۔ مشرکین نے کہا تھا کہ آپؐ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپؐ کے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک آپؐ ہمارے پاس نوشتہ نہ لائیں جس کو ہم پڑھ لیں۔ یہ نوشتہ لانے کی قید کے کیا معنیٰ! کیا آسمان پر چڑھنا ہی آپؐ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا؟ کیا ان کی یہ لغو خواہشات ان کی سرکشی اور عناد کا واضح ثبوت نہیں ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ جن کاموں کی مشرکین نے فرمائش کی تھی ان میں سے کچھ تو ناممکن تھے اور باقی کا دعوائے نبوّت کی صداقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کے لیے فرمائشی معجزات دکھانے ضروری ہیں، جب بھی یہ ایسے کام نہیں تھے جن کی فرمائش پوری کرنا ضروری ہو۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ جن کاموں کی فرمائش کا ان آیات میں ذکر ہے ان کی تعداد چھ ہے۔ ان میں سے تین کا وقوع محال

ہے اور تین[3] کا ممکن ۔ لیکن ان کا بھی مُدّعیٔ نبوت کی صداقت سے تعلّق نہیں[1]۔

جو تین کام محال ہیں وہ یہ ہیں :۔

پہلا تو ۔۔ آسمان کا ٹکڑے ہو کر گرنا ہے ۔ اگر واقعی ایسا ہو تو زمین تباہ ہو جائے اور اہلِ زمین ہلاک ہو جائیں ۔ ایسا صرف اس وقت ہو گا جب دنیا کا خاتمہ نزدیک ہو گا ۔ اس کی نبیؐ اکرمؐ نے انھیں خبر دی تھی ۔ یہ مشرکین کے اس قول سے ظاہر ہے : "جیسا کہ آپؐ کہا کرتے ہیں" ۔ قرآن میں متعدد مقامات پر آسمان کے ٹکڑے ہونے کا تذکرہ ہے :

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ .

جب آسمان پھٹ جائے گا ۔ (سورۂ انشقاق ۔ آیت ۱)

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ .

جب آسمان کے ٹکڑے ہو جائیں گے ۔ (سورۂ انفطار ۔ آیت ۱)

إِنْ نَشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ .

اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں ۔ (سورۂ سبا ۔ آیت ۹)

مگر قبل از وقت آسمان کا ٹکڑے ہو کر گرنا محال ہے کیونکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ مخلوق باقی رہے اور اس کی حصولِ

---

[1] صفحہ ۲۰۲ پر ضمیمہ (ج) ملاحظہ فرمائیں ۔

کمال کی طرف رہنمائی کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ حکیمِ مطلق کوئی ایسا کام کرے جو اس کی حکمت کے تقاضوں کے منافی ہو۔

دوسرا کام جو محال ہے وہ۔ اللہ کو سامنے لاکر کھڑا کر دینا ہے کہ لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ یہ اس لیے ناممکن ہے کہ اللہ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اللہ نہ محدود ہے نہ اس کی کوئی سمت ہے نہ رنگ، نہ صورت۔ یہ سب باتیں ناممکن ہیں۔

تیسرا ناممکن کام۔ اللہ کے پاس سے کوئی نوشتہ لانا ہے۔ دراصل مشرکین یہ چاہتے تھے کہ اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی نوشتہ لاکر ان کو دکھایا جائے۔ ان کی مانگ صرف یہ نہیں تھی کہ کوئی کتاب اللہ کی طرف سے کسی نہ کسی طریقے سے نازل ہو۔ ورنہ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے آسمان سے نازل کرنے کی شرط لگاتے۔ زمین پر جو کتاب موجود تھی اس سے وہ مقصد پورا ہو رہا تھا جو آسمان سے آنے والی کتاب سے ہوتا۔ اس لیے اس میں شک نہیں کہ ان کی مانگ کو پورا کرنا ناممکن تھا کیونکہ اللہ نہ جسم ہے نہ اس کے اعضاء ہیں۔ اللہ کی پاک ذات ایسی باتوں سے بہت بلند ہے۔

باقی تین کام اگرچہ محال نہیں تھے لیکن وہ دعوائے نبوّت کی صداقت کی دلیل نہیں بن سکتے تھے اس لیے کہ زمین سے چشمہ جاری کرنے یا کھجور اور انگوروں کے باغ کا مالک ہونے یا سونے سے بنے ہوئے گھر کا مالک ہونے سے نبوّت کا کوئی تعلق نہیں۔ بعض لوگوں کو اکثر ان میں سے کوئی بات حاصل ہو جاتی ہے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نبی ہوجاتا ہے بلکہ بعض لوگوں کو تو یہ تینوں باتیں حاصل ہوتی ہیں پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مؤمن بھی ہیں نبی ہونا تو دُور کی بات ہے۔ جب ان باتوں کا نبوّت کے دعوے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ نبوّت کی صداقت کی دلیل ہیں تو ان کے متعلق کسی فرمائش کو پورا کرنا محض فعلِ عبث ہے جو کسی باہوش پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ تین باتیں اس وقت نبوّت کی صداقت کی دلیل نہیں ہوسکتیں، جب یہ معمول کے مطابق اور معروف اسباب کی بنا پر وجود میں آئیں لیکن اگر ان کے اسباب غیر معمولی ہوں تو یہ نشانِ خداوندی اور نبوّت کی دلیل بن جائیں گی۔

جواب

فی نفسہٖ تو یہ بات درست ہے مگر مشرکین کا مقصد یہ تھا کہ یہ چیزیں ہونی چاہئیں، چاہے وہ عام قدرتی قوانین کے تحت ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ اللہ کا رسولؐ غریب ہو اور اس کے پاس کچھ نہ ہو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ.

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کلامِ الٰہی ہے تو ان دو بستیوں (مکّہ اور طائف) کے رہنے والوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ (سورۂ زخرف۔ آیت ۳۱)

ان کا خیال تھا کہ نبی کے پاس بہت دولت ہونی چاہیے۔
یہ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ باغ اور سونے کا بنا ہوا گھر صرف نبی کا ہو اور کسی کا نہیں۔ اگر وہ یہ باتیں معجزاتی طور پر چاہتے تھے تو پھر اس شرط کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ باغ اور گھر کی فرمائش کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی، ایک دانۂ انگور یا ایک مثقال سونا پیدا کرنا بھی کافی تھا۔
مشرکین کے یہ کہنے کا کہ — آپؐ ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دیں — یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی ایسا چشمہ چاہتے تھے جو ان کے لیے مخصوص ہو اور نبی کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ دراصل ایسا چشمہ چاہتے تھے جس سے وہ فائدہ اُٹھا سکیں۔ ان دو باتوں میں فرق ظاہر ہے۔ رسول اللہؐ نے یہ اعتراف نہیں کیا کہ میں معجزہ پیش کرنے سے عاجز ہوں۔ جیسا کہ شبہ کیا گیا ہے بلکہ سبحان اللہ کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ عاجز نہیں ہے، وہ ہر بات پر قادر ہے۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا، نہ اس کا سامنا کر سکتا ہے۔ وہ کسی کی فرمائش کا بھی پابند نہیں۔ پیغمبر بھی ایک انسان ہے اور اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ ہر کام کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جو چاہے کرے۔
قرآن کے علاوہ دوسرے معجزات کے منکرین جن دوسری آیات سے استدلال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:
لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ.

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا۔ آپ کہہ دیجیے کہ غیب کی خبر اللہ ہی کو ہے۔ سو تم بھی منتظر رہو میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔

(سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۲۰)

منکرین کا استدلال یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ سے مشرکین نے معجزے کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے اپنے کسی معجزے کا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ غیب کی خبر اللہ ہی کو ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ آپؐ کا کوئی معجزہ نہیں تھا۔

اس آیت کے قریب المعنی کچھ اور بھی آیات ہیں مثلاً:

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.

کفّار یہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے معجزہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ حالانکہ آپ صرف خبردار کرنے والے ہیں اور ہر قوم میں ہادی ہوتے چلے آئے ہیں۔

(سورۂ رعد۔ آیت ۷)

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ.

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے معجزہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ آپ کہہ دیجیے کہ

بے شک اللہ کو پوری قدرت ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن ان میں سے اکثر بے خبر ہیں۔ (سورۂ انعام آیت ۳۷)

جواب

پہلا جواب تو وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان مشرکین کی مانگ یہ نہیں تھی کہ رسولِ اکرمؐ اپنی نبوّت کے ثبوت میں کوئی معجزہ دکھائیں بلکہ یہ خاص معجزات کے طالب تھے۔ قرآن نے کئی جگہ ان کی فرمائشوں کی تصریح کی ہے۔ ایک مثال تو ابھی گزر چکی، بعض دوسری مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ.

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی فرشتہ کیوں بھیجا گیا؟ (سورۂ انعام۔ آیت ۸)

وَقَالُوْا يَآ اَيُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ. لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ. (سورۂ حجر۔ آیات ۶۔۷)

کفّار نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے تو ضرور مجنون ہے۔ اگر تو سچّا ہے تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتا۔ (سورۂ حجر۔ آیات ۶۔۷)

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ. لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا. اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ

لَهُ جَنَّةٌ يَّأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا.

کفّار کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا جو خبردار کرتا رہتا؟ یا اس کے پاس کوئی خزانہ آپڑتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس میں سے یہ کھایا کرتا۔ ہاں یہ ظالم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تم ایک سحرزدہ شخص کا اتّباع کر رہے ہو۔

(سورۂ فرقان۔ آیات ۷۔۸)

جیسا کہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے فرمائشی معجزات کا دکھایا جانا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اگر مشرکین کا مقصد یہ ہوتا کہ انھیں کوئی بھی معجزہ دکھا دیا جائے تو نبی اکرمؐ ضرور کم از کم قرآن کا حوالہ دیتے جس کو آپ نے متعدد بار تحدّی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے مخالفین استدلال کرتے ہیں اور ایسی ہی دوسری آیات سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں :۔

- رسول اکرمؐ نے اپنے تمام معجزات میں سے قرآن کو خاص طور پر دُنیا کے سامنے تحدّی کے ساتھ پیش کیا ہے اور جیسا کہ ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کہ آفاقی اور ابدی نبوّت کا معجزہ بھی آفاقی اور ابدی ہی ہونا چاہیے اور وہ معجزہ صرف قرآن ہے۔ آپ کے باقی معجزات میں کوئی ایسا معجزہ نہیں جس کو لازوال

کہا جا سکے۔

(۴)۔ رسولِ اکرمؐ اپنی خواہش اور اختیار سے معجزہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ معجزہ کے لیے اللہ کے حکم اور اجازت کی ضرورت تھی۔ کسی کی فرمائش کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا جیسا کہ آیاتِ ذیل سے ظاہر ہے، دوسرے انبیاءؑ کے ساتھ بھی یہی صورت تھی:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۔

کسی رسول کے اختیار میں یہ بات نہیں کہ ایک نشانی بھی اللہ کے حکم کے بغیر لا سکے۔ ہر زمانہ کے مناسب جو کچھ ہے لکھا ہوا ہے۔

(سورۂ رعد۔ آیت ۳۸)

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔

کسی رسول کے اختیار میں یہ بات نہیں کہ ایک نشانی بھی اللہ کے حکم کے بغیر لا سکے۔ پھر جب اللہ کا حکم آئے گا تو ٹھیک فیصلہ ہو جائے گا۔ اس وقت اہلِ باطل خسارہ میں رہ جائیں گے۔ (سورۂ مؤمن۔ آیت ۷۸)

قرآنِ کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے صاف پتا چلتا ہے

کہ نبی اکرم صلعم سے معجزات کا صدور ہوا مثلاً

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ.

وقت نزدیک آپہنچا اور چاند شق ہوگیا۔

(سورۂ قمر۔ آیت ۱)

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ.

جب یہ لوگ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اسے نظرانداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ (سورۂ قمر۔ آیت ۲)

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ.

جب کوئی نشانی ان کے پاس آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جیسی اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔ (سورۂ انعام۔آیت ۱۲۴)

دوسری آیت میں معجزے کے لیے آیت کا لفظ استعمال ہوا ہے، چونکہ یہاں دیکھنے کا ذکر ہے اس لیے اس سے قرآنی آیت مراد نہیں ہوسکتی۔ ورنہ "دیکھتے ہیں" کے بجائے "سنتے ہیں" کہا جاتا۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ شق القمر کا بھی ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ایک معجزہ ہے۔

تیسری آیت میں بھی "آنے" کی بات کی گئی ہے نازل ہونے

کی نہیں۔ "جادو جس کا سلسلہ چل رہا ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ بار بار معجزات دکھاتے رہے ہیں۔ اس لیے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پچھلی آیات سے معجزوں کے وقوع کی نفی ہوتی ہے جب بھی یہ نفی اُس زمانے سے مخصوص ہوگی جب وہ آیات نازل ہوئی تھیں، ان کے نزول کے بعد کے زمانے میں معجزات کے واقع ہونے کی نفی مراد نہیں ہوسکتی۔

اس تمام بحث کا **خلاصہ** یہ ہے کہ

۱۔۔۔ قرآنی آیات میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے قرآن کے علاوہ دُوسرے معجزات کی نفی ہوتی ہو بلکہ ان سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے معجزات کا وجود بھی تھا کہ جن کا مخالفین انکار کرتے ہیں۔

۲۔۔۔ معجزہ دکھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے اختیار میں نہیں تھا بلکہ یہ معاملہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں تھا۔

۳۔۔۔ دعوائے نبوّت کے لیے صِرف وہ معجزہ لازمی ہے جو اتمامِ حجّت کے لیے ضروری ہو اور جس پر نبوّت کی تصدیق موقوف ہو۔ اس سے زائد معجزات کا صدور نہ اللہ کے لیے ضروری ہے اور نہ کسی کی فرمائش پوری کرنا نبی کے لیے لازم ہے۔

۴۔۔۔ اِس اُمّت میں ایسا معجزہ ممنوع ہے جس کے قبول نہ کرنے کے نتیجے میں یہ اُمّت ہلاک ہوجائے یا جو بطور عذاب

کے آئے۔ ایسا معجزہ کسی کی فرمائش سے بھی نہیں آسکتا چاہے ایسی فرمائش کچھ لوگ کریں یا سب کے سب۔

۵—— آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لازوال معجزہ جو آپؐ نے بطور تحدّی ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا وہ اللہ کی کتاب "قرآن" ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی تھی۔ گو اس کے علاوہ بھی آپؐ نے بہت سے معجزات دکھلائے مگر وہ ایسے ہی تھے جیسے دُوسرے انبیاءؑ کے معجزات جو لازوال نہیں تھے۔

توریت وانجیل میں آنحضرتؐ کی نبوّت کی بشارت

قرآن مجید میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے آنحضرتؐ کی نبوّت کی بشارت دی تھی اور اس بشارت کا ذکر توریت وانجیل میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ.

جو لوگ ایسے نبیِّ اُمّی رسولؐ کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت وانجیل میں

لکھا ہوا پاتے ہیں اور جن کی صفت یہ ہے کہ وہ
ان کو نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بُری باتوں
سے منع کرتے ہیں۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷)

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ
اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ
مِنَ التَّوْرٰۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی
اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ.

اور (یاد کرو) جب عیسیٰؑ بن مریم نے کہا کہ اے
بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا
ہوں کہ تصدیق کروں توریت کی جو مجھ سے پہلے آچکی
ہے اور بشارت دوں اپنے بعد آنے والے ایک رسول
کی جس کا نام احمدؐ ہوگا۔ (سورۂ صف۔ آیت ۶)

آنحضرتؐ کے زمانۂ حیات میں اور آپؐ کی وفات کے بعد
بکثرت یہود و نصاریٰ آپؐ پر ایمان لائے۔ یہ اس بات کی قطعی
دلیل ہے کہ آپؐ کے زمانۂ دعوت میں یہ بشارت ان دونوں
کتابوں میں موجود تھی۔ اگر ان کتابوں میں اس بشارت کا ذکر نہ
ہوتا تو یہ بات قرآن کے دعوے کو جھٹلانے اور آنحضرتؐ کی دعوت
کو مسترد کرنے کے لیے کافی ہوتی اور یہود و نصاریٰ شدّت سے
آپؐ کی حقّانیت کا انکار کرتے۔ رسولِ خداؐ کے زمانے میں اور
آپؐ کے بعد یہود و نصاریٰ کے بکثرت ایمان لانے اور آپؐ کی
دعوت کی تصدیق کرنے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اس

زمانے میں یہ بشارت موجود تھی۔ بنا بریں جو شخص حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بھی ایمان لائے اور اس کے لیے آپؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی مزید معجزے کی ضرورت نہیں۔

البتہ جو قومیں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو اور ان کی کتابوں کو نہیں مانتیں ان کے لیے معجزے کی ضرورت ہے۔ یہ لازوال معجزہ قرآن مجید ہے جو نبی اکرمؐ کی صداقت اور ان کے دعوے کی صحّت کی دلیل ہے۔

قرآن مجید کے علاوہ آپؐ کے دوسرے معجزات بھی جو اجمالاً تواتُر کے ساتھ منقول ہیں انبیاء سابقینؑ کے معجزات سے زیادہ تصدیق کے مستحق ہیں۔

ضمیمہ

(الف) مُصنّف کی ایک یہودی عالم سے گفتگو

ایک دفعہ ایک یہودی عالم سے میری اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ "یہودی مذہب کا زمانہ یہودی انبیاء کے معجزات کے ساتھ ختم ہوگیا۔"

میں نے اس یہودی عالم سے کہا کہ یہ بتلاؤ کہ کیا حضرت موسیٰؑ کی شریعت صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے یا تمام اقوامِ عالم کے لیے عام ہے؟ اگر یہ صرف یہودی قوم سے مخصوص ہے تو دوسری اقوام کے لیے کسی دُوسرے پیغمبر کی ضرورت ہوگی۔ تمھاری نظر میں ایسا پیغمبر سوائے پیغمبرِ اسلامؐ کے کون ہوسکتا ہے؟ اگر حضرت موسیٰؑ کی شریعت عمومیت رکھتی ہے اور یہودی مذہب ایک عالمگیر مذہب ہے اور سب انسان اس کے مخاطَب ہیں تو اس کے لیے ثبوت، مضبوط دلیل اور کسی زندہ گواہ کی ضرورت ہوگی جبکہ تمھارے پاس نہ ایسی کوئی دلیل ہے اور نہ ہی ایسا کوئی گواہ موجود ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے معجزات ان کے اپنے زمانے سے مخصوص تھے اور زمانہ گزرنے کے بعد ان کا کوئی ایسا نشان یا ثبوت باقی نہیں رہا جو ہر زمانے میں پُورے وثوق کے

ساتھ ان معجزات کا وجود اور یہودی شریعت کا دوام ثابت کرسکے۔
اگر یہ کہو کہ اگرچہ یہ معجزات اب باقی نہیں رہے لیکن چونکہ روایات تواتر کے ساتھ ہر زمانے میں مسلسل نقل ہوتی آرہی ہیں اس لیے ان کا وجود مسلّم ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اوّل تو معجزہ مسلسل روایات سے صرف اس وقت ثابت ہوسکتا ہے جب ہر نسل اور ہر قوم میں اس کے بیان کرنے والوں کی تعداد اتنی ہو کہ اس کے متعلق کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہے جبکہ تم حضرت موسیٰ ؑ کے معجزات کے بارے میں اس طرح کا تواتر ثابت نہیں کرسکتے۔ دوسرے یہ کہ اگر معجزات کی روایات ہی ان کے ثبوت کے لیے کافی ہوں تو یہ بات، کچھ حضرت موسیٰ ؑ کے معجزات ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ تم حضرت موسیٰ ؑ کے معجزات بیان کرتے ہو اور عیسائی حضرت عیسیٰ ؑ کے معجزے بیان کرتے ہیں۔ مسلمان بھی اسی طرح اپنے پیغمبر ؐ کے معجزے نقل کرتے ہیں۔ اب ان روایات میں کیا فرق ہے کہ تمھاری بات تو مان لی جائے اور دوسروں کی بات نہ مانی جائے۔ اگر صرف معجزات کا منقول ہونا ہی کسی پیغمبر کی تصدیق کے لیے کافی ہے تو تم ان تمام دوسرے پیغمبروں کے قائل کیوں نہیں ہو جن کے معجزات منقول ہیں؟
یہودی عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ یہودی جو معجزے حضرت موسیٰ ؑ کے بیان کرتے ہیں ان کی تصدیق عیسائی اور مسلمان بھی کرتے ہیں اور وہ بھی ان کی صحّت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن

دوسرے پیغمبروں کے معجزے اس طرح سب تسلیم نہیں کرتے اس لیے ان کے ثبوت کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔

میں نے جواب میں کہا : یہ تو درست ہے کہ عیسائی اور مسلمان بھی حضرت موسیٰؑ کے معجزوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس لیے نہیں کہ ان کی روایات متواتر ہیں یا یہودی ان کو بیان کرتے ہیں بلکہ اس لیے کہ خود ان کے پیغمبروں نے ان معجزات کی خبر دی ہے۔ عیسائی اور مسلمان حضرت موسیٰؑ کے معجزے اپنے پیغمبروں کے کہنے پر تسلیم کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے پیغمبروں کے قائل نہ ہوتے تو حضرت موسیٰؑ کے معجزات کو ماننے کی کوئی صورت نہیں تھی، ان کی نبوّت تو دُور کی بات ہے۔

یہ اعتراض کچھ یہودی مذہب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام سابقہ مذاہب پر وارد ہوتا ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا معجزہ زندۂ جاوید ہے۔ ہر زمانے اور ہر دَور میں ہر قوم اور نسل اس سے واقف رہی ہے اور یہ قیامت تک ساری دُنیا کو دعوتِ حق دیتا رہے گا۔ یہ معجزہ قرآنِ کریم ہے اور ہم اِس معجزے کے ذریعے اسلام کو پہچانتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب ہم نے ایک دفعہ اسلام کو قبول کر لیا تو لامحالہ ہمارے لیے ضروری ہو گیا کہ ہم انبیائے سابقین کی بھی تصدیق کریں کیونکہ قرآن کریم اور پیغمبرِ اسلامؐ نے ان کی توثیق اور تصدیق کی ہے۔

مختصر یہ کہ صرف قُرآن ہی وہ واحد لافانی معجزہ ہے جو تمام

سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا اور گزشتہ انبیاءؑ کی سچّائی اور پاکبازی کی شہادت دیتا ہے۔

(ب) قرآن کا ترجمہ اور اس کی شرائط

خداوندِ عالم نے پیغمبرِ اسلامؐ کو انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا اور اس مقصد میں قرآن کے ذریعے آپ کو کامیابی عطا فرمائی۔ پس قرآن ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو انسانوں کو ابدی سعادت سے ہم کنار کرتی اور عزّت و عظمت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچاتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور اس کی مہربانی ہے کہ قرآن تمام بنی نوعِ انسان کے لیے نازل ہوا ہے اور کسی خاص قوم سے مختص نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اس کی متقاضی ہوئی کہ اس نے اپنی کتاب تو اپنے رسولؐ کی قوم کی زبان میں نازل کی لیکن اس کی تعلیمات اور قانون ایسے بنائے جو سارے جہان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے کافی و وافی ہیں۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ قرآن کو سمجھیں، اس سے رہنمائی حاصل کریں اور اس روشن چراغ کو ہاتھ میں لے کر سعادت و ہدایت کے راستے پر آگے بڑھیں۔

چونکہ قرآن ساری دنیا کے انسانوں کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو تاکہ وہ سب لوگ بھی جو اس کی اصل زبان سے ناواقف ہیں

اس کے حقائق و معارف سے آگاہ ہو سکیں۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والا جس زبان میں ترجمہ کرے اسے اس زبان پر مکمل عبور حاصل ہو۔ کیونکہ ترجمہ کتنا ہی عمدہ اور شستہ ہو پھر بھی وہ اس فصاحت و بلاغت کا حق ادا نہیں کر سکتا جو قرآن سے مخصوص اور اس کا طرۂ امتیاز ہے پھر بھی مترجم کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی آیات اور اس کے اسلوبِ بیان میں جو نکات اور باریکیاں مضمر ہیں ان کو اپنے ترجمے میں زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کرے اور قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم سادہ اور دل نشین عبارت میں ادا کرے۔

یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب مترجم قرآن کے معنیٰ و مطلب کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ واضح رہے کہ قرآن کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے ان تین امور سے واقفیت ضروری ہے :-

(۱) الفاظ کا ظاہری مفہوم کیا ہے ؟
(۲) عقلِ سلیم اس کے بارے میں کیا کہتی ہے ؟
(۳) قرآن کی تفسیر کے بارے میں ائمہؑ اہلبیتؑ سے کون کون سی روایات آئی ہیں۔

قرآن کے مترجم کے لیے ان تین اُمور سے کامل واقفیت اور ترجمہ کرتے وقت ان سب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسے چاہیے کہ ان کی مدد سے قرآن کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرے اور پھر سادہ الفاظ میں غیر زبان میں ترجمہ کرے۔ رہے مفسّرین کے

ذاتی خیالات اور نظریات جو انھوں نے اپنی تفسیر کی کتابوں میں بیان کیے ہیں تو ان کا کچھ اعتبار نہیں اور نہ مترجم کو ان پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اگر قرآن کے ترجمے میں ان سب باتوں کا لحاظ رکھا جائے تو نہ صرف قرآن کے ترجمے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی بلکہ ایسا ترجمہ ضروری اور مناسب بھی ہوگا تاکہ ہر قوم کے افراد اپنی ہی زبان میں قرآن کے حقائق و معارف سے مستفید ہوسکیں۔ چونکہ قرآن سب کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کا فائدہ کسی خاص زبان کے جاننے والوں تک محدود رہے اور جو اس زبان سے ناآشنا ہیں وہ بلند پایہ قرآنی حقائق و معارف سے محروم رہیں۔

(ج) رسول اللہؐ کے سامنے قریش کی ہٹ دھرمی

وہ روایات جو ان آیات کے شان نزول کے بارے میں آئی ہیں کہ جن میں قریش کے فرمائشی معجزات کا ذکر ہے، وہ اس نکتہ کی صحّت کی گواہ ہیں جو ہم نے اس سلسلہ کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا تھا۔ چنانچہ تفسیر برہان میں اسی آیت کے ذیل میں یہ روایت آئی ہے:

ایک روز رسولِ خداؐ کعبہ کی دہلیز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ قریش کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی۔ اس جماعت میں ولید بن مغیرہ مخزومی، ابو بختری بن ہشام، ابوجہل بن ہشام،

عاص بن وائل سہمی، عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی اور متعدد دُوسرے افراد شامل تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ایک صحابی کے ساتھ انھیں اللہ کا کلام پڑھ کر سنایا اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ کی۔ قریشی آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ محمدؐ کی تنظیم کافی ترقی کر گئی ہے اور اس کی باتوں نے خاصی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ آؤ ذرا اُسے تنگ کریں، کچھ بُرا بھلا کہیں، عیب جوئی کریں اور کچھ دلائل دے کر اس کی باتوں کو غلط ٹھہرائیں تاکہ وہ اپنے اصحاب کی نظروں میں گر جائے اور اس کی وقعت کم ہو جائے، شاید اس طرح وہ گمراہی اور سرکشی چھوڑ دے اور اس نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے اس سے باز آجائے۔ اگر اس طرح وہ اپنی غلط روی سے باز آجائے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ پھر ہم ننگی تلواروں سے اسے نیست و نابود کر دیں گے۔

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ابوجہل کہنے لگا: تم میں کوئی ہے جو اس بات کا ذمّہ لے کہ محمدؐ سے بحث کر کے اُسے لاجواب کر دے۔

عبداللہ بن ابی امیہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ کہنے لگا: میں اس کام کی ذمّہ داری لینے کو موجود ہوں۔ کیا تم اس کام کے لیے میرا انتخاب نہیں کرو گے؟ دیکھو تو میں شریف النسب بھی ہوں، شاعر بھی ہوں اور حاضر جواب بھی۔

ابوجہل نے کہا: مجھے منظور ہے۔ میں تمھیں اس کام کے لیے منتخب کرتا ہوں، پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آؤ!

ہم سب محمدؐ کے پاس چلیں تاکہ عبداللہ ان سے بات کرے۔
چنانچہ جب وہ سب لوگ رسول اللہؐ کے پاس پہنچے تو عبداللہ بن ابی امیہ نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا :
محمدؐ! تم نے دعویٰ تو بہت بڑا کیا ہے ! تم کہتے ہو کہ پروردگارِ عالم نے تمھیں رسول بنا کر بھیجا ہے مگر یہ بات تو کچھ خدائے بزرگ و برتر کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی کہ وہ تم جیسے کو اپنا نمائندہ مقرر کرے۔ تم بھی تو ہماری ہی طرح کے انسان ہو آخر تم میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ تم بھی ہماری ہی طرح کھاتے پیتے ہو۔ ہماری ہی طرح کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے ہو ــــ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ روم و ایران کے بادشاہ صرف ایسے شخص کو اپنا نمائندہ مقرر کرتے ہیں جو بڑا ہو، جس کے پاس خوب دولت ہو، جس کے پاس شاندار حویلیاں اور پُرتکلف محلّات ہوں، جس کے پاس اعلیٰ درجے کا ساز و سامان ہو اور کنیزوں، غلاموں اور نوکروں چاکروں کی کمی نہ ہو۔ خداوندِ عالم کی شان تو ان ملوک و سلاطین سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ سب بھی اسی کے بندے ہیں۔ اس کا نمائندہ تو ملوک و سلاطین کے نمائندوں سے کہیں بہتر ہونا چاہیے۔ اگر خدا کو کوئی پیغمبر بھیجنا ہی تھا تو وہ کسی دولت مند اور مقتدر شخص کا انتخاب کرتا نہ کہ ایک غریب اور غیر معروف شخص کا ! آخر یہ قرآن جسے تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے آیا ہے، ان دو عظیم شہروں (مکّہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا ؟ مکّے کے

ولید بن مغیرہ یا طائف کے عروہ بن مسعود ثقفی پر کیوں نہیں اُترا جو بڑے رئیس بھی ہیں اور سربرآوردہ بھی ؟!

عبداللہ کی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: بندۂ خدا کیا تمھاری بات ختم ہوگئی ؟

عبداللہ نے کہا: ہاں بات تو ختم ہوگئی مگر آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہم تم پر یوں ہی ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم ایمان لے آئیں تو ایسا کرو کہ اس مکّے کی سرزمین میں ہمارے لیے چشمے جاری کردو۔ یہاں کی زمین ناہموار اور سنگلاخ ہے، ہر طرف پہاڑیاں اور درّے ہیں، تم اسے ہموار کر کے اس میں ہمارے لیے چشمے نکال دو کیونکہ ہمیں چشموں کی سخت ضرورت ہے یا پھر ایسا کرو کہ یہاں کھجور اور انگور کے باغ لگا دو جن کے درمیان پانی کی نہریں رواں ہوں، ان باغوں کے پھل خود بھی کھاؤ اور اس سے دوسروں کو بھی فیض پہنچاؤ۔ یا ایسا کرو کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے سروں پر گرا دو تم تو خود کہتے ہو کہ: "اگر آسمان کے ٹکڑے ان کے سروں پر گریں تو کہیں گے کہ یہ کچھ نہیں ہے، بس جمے ہوئے اَبر کے گالے ہیں جو گر رہے ہیں" ہوسکتا ہے کہ ہم بھی یہی کہیں۔

عبداللہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: لیکن اگر تم یہ سب کام کر بھی دو، تب بھی ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک تم اللہ اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا نہ کردو تاکہ ہم انھیں نزدیک سے دیکھ کر

پہچان لیں یا اپنے لیے سونے کا مکان بناؤ اور اس میں سے ہمیں بھی حصّہ دو تاکہ ہمارے پاس دولت کی فراوانی ہوجائے اور ہم کسی چیز کے محتاج نہ رہیں۔ پھر بھی ممکن ہے کہ ہم سرکشی کریں جیساکہ تم خود کہتے ہو کہ "انسان جب بے نیاز ہوجاتا ہے تو وہ سرکشی پر اُتر آتا ہے۔" یا پھر ایسا کرو کہ اُڑ کر آسمان پر چلے جاؤ۔ صرف اُڑنا ہی کافی نہیں، وہاں سے اللہ کی طرف سے ایک چِٹّھی لاؤ جس میں لکھا ہو کہ "یہ چِٹھی اللہ کی طرف سے عبداللہ ابن ابی امیہ مخزومی اور اس کے دوستوں کے نام ہے تاکہ وہ محمّد ابن عبداللہ پر ایمان لے آئیں جو ہمارا پیغمبر ہے۔ انھیں چاہیے کہ اس کی تصدیق کریں اور جو وہ کہتا ہے اسے ہمارا کہا ہوا سمجھیں۔"

عبداللہ نے آخر میں کہا: اگر تم نے یہ سب کام کر بھی دیے پھر بھی معلوم نہیں کہ ہم ایمان لائیں گے یا نہیں۔ البتہ ایسا کرو کہ ہمیں آسمان پر لے جاؤ، آسمان کے دروازے ہمارے لیے کھول دو اور ہمیں اندر پہنچا دو۔ پھر بھی ہوسکتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ "تم نے ہم پر جادو کر دیا ہے یا یہ کہ ہماری نظربندی کردی ہے۔"

رسول اللہؐ: اے اللہ! تو سب کچھ سُن رہا ہے، سب کچھ جانتا ہے اور اپنے بندوں کی ہر بات سے واقف ہے۔

پھر آپؐ نے عبداللہ سے فرمایا: تم کہتے ہو کہ ایران اور روم کے بادشاہ اپنے گورنر، فوج کے اعلیٰ افسر اور اپنے ایلچی

دولت مند اور مقتدر لوگوں میں سے منتخب کرتے ہیں، اپنی جگہ یہ بات درست ہے، لیکن اللہ کا معاملہ ان سے جدا ہے، وہ اپنی حکومت کا نظم ونسق اور طرح چلاتا ہے، وہ اپنی دنیا کے کاروبار میں تمھارے خیالات اور تمھاری خواہشوں کی پیروی نہیں کرتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اگر اللہ کے پیغمبروں کے پاس شاندار اور پرتکلّف محل ہوں گے تو وہ ان میں بیٹھے اونگھتے رہیں گے۔ اگر لونڈی، غلام اور خدمتگار ہوں گے تو ان میں غرور اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہوجائے گا اور وہ لوگوں سے کٹ جائیں گے اور دور ہوجائیں گے۔ کیا ایسی صورت میں رسالت کا مقصد فوت نہیں ہوجائے گا اور ہدایت ورہبری کا پہیہ بیکار پڑا پڑا زنگ آلود نہیں ہوتا رہے گا؟

رہا تمھارا یہ کہنا کہ اگر میں واقعی پیغمبر ہوتا تو میرے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا جو میری نبوّت کی گواہی دیا کرتا اور تم اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھتے اور اپنے کانوں سے اس کی گواہی سنتے تو یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اول تو فرشتے کو کوئی دیکھ نہیں سکتا، کیونکہ فرشتہ ہوا کی طرح ہوتا ہے جس کا کوئی ٹھوس جسم نہیں ہوتا کہ جسے دیکھا جاسکے گا۔ دوسرے اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی طرح تمھاری بینائی اس قدر تیز ہوجائے کہ تم فرشتے کا بھی مشاہدہ کرسکو تو جب تم اسے دیکھو گے تو پھر بھی یہی کہو گے کہ یہ فرشتہ نہیں کوئی انسان ہے کیونکہ اگر فرشتہ تمھارے سامنے آئے گا بھی تو وہ انسانی شکل ہی میں آئے گا، تاکہ تم اس سے وحشت نہ کھاؤ

اس سے بات چیت کرسکو اور جب وہ میری گواہی دے تو اس کی گفتگو سمجھ سکو۔ اِس صورت میں بھی تم یہی کہو گے کہ یہ تو انسان ہے جو فرشتہ کے نام سے میرے حق میں جھوٹی گواہی دے رہا ہے۔

اور یہ جو تم مجھ پر جادو کا الزام لگاتے ہو اور کہتے ہو کہ اس پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ تو یہ بھی بہت ہی نامناسب اور غیر معقول بات ہے۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ مجھ پر جادو ہوا ہے جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں عقل و خرد اور سمجھ بُوجھ میں تم سے بڑھ کر ہوں۔ کیا اس دن سے جب سے میں پیدا ہوا ہوں آج تک جب کہ میری عمر چالیس سال سے متجاوز ہو چکی ہے تم نے کبھی دیکھا ہے کہ میں نے کوئی جُرم کیا ہو یا کوئی خطا کی ہو؟ تم نے کبھی مجھے جھُوٹ بولتے یا لاف زنی کرتے دیکھا ہے؟ میں نے کبھی کوئی خلاف عقل کام کیا ہے؟ اگر کوئی شخص اتنی طویل مدّت میں اس طرح غلطی، خطا اور لغزش سے محفوظ رہے اور پوری زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی سرزد نہ ہو تو کیا تمھارے خیال میں وہ صرف اپنے بل بوتے پر ایسا کرسکتا ہے جب تک کہ رُوحانی قوت اور تائیدِ ایزدی اس کے شاملِ حال نہ ہو؟

اور یہ جو تم کہتے ہو کہ یہ قرآن ان دو[۲] شہروں کے کسی سربرآوردہ اور دولت مند شخص پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ تو اس

سوال یا اعتراض کا جواب واضح ہے۔ تمھاری طرح اللہ تعالیٰ دولت و ثروت کو انسانی عظمت و کمال کے لیے ضروری نہیں سمجھتا۔ تمھاری طرح اس کی نظر میں مال وزر کی وقعت نہیں۔ اس پر کسی کا رُعب نہیں پڑتا۔ یہ تو تم ہو جو مقتدر افراد سے ڈرتے ہو، انھیں بڑا آدمی جانتے ہو اور سمجھتے ہو کہ صرف یہی لوگ ہر بڑے منصب یہاں تک کہ نبوّت و رسالت کے بھی اہل ہیں۔

اور یہ جو کہتے ہو کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لیے زمین پر چشمے جاری نہیں کروگے۔ تو یہ بھی کوئی عقل کی بات نہیں، تم ایسے معجزوں کی فرمائش کر رہے ہو جن میں سے کوئی ایک بھی قابلِ عمل نہیں۔

پھر اگر ان میں سے کوئی بات پوری بھی کردی جائے تو یہ نبوّت کی دلیل تو نہیں ہوگی۔ باغ اور پانی کی نہر کا نبوّت سے کیا تعلق؟ اللہ کے رسول کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ لوگوں کی ناواقفیت کا فائدہ اٹھائے اور کسی ایسی چیز پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھے جو نبوّت کا ثبوت نہیں۔

تمھارے فرمائشی معجزات کا دُوسرا حصّہ ایسا ہے کہ اگر اُسے پُورا کر بھی دیا جائے تو اس کا نتیجہ تمھاری اپنی ہلاکت ہوگا حالانکہ پیغمبر احقاقِ حق اور دِلوں میں ایمان کا بیج بونے کے لیے معجزہ دکھاتا ہے، لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کے لیے نہیں۔ تم ایسے معجزوں کی فرمائش کرکے خود ہی اپنی تباہی و بربادی کی درخواست کر رہے ہو۔ اللہ اپنے بندوں پر مہربان اور ان کی

صلاحیتوں سے خُوب واقف ہے۔ وہ کسی کی جاہلانہ درخواست پر اسے تباہی اور بدبختی کے گڑھے میں نہیں دھکیلتا۔

ایک اور حصّہ تمھارے فرمائشی معجزات کا قطعاً ناممکن اور ناقابلِ عمل ہے (جیسے اللہ اور فرشتوں کی رؤیت اور خود اللہ کی دستخطی تحریر لانا)۔

تمھارے فرمائشی معجزات کے چوتھے حصّے کا مقصد خود تمھارے اپنے اقرار کے بموجب ضد اور ہٹ دھرمی اور حقیقت کا مذاق اڑانے کے سوا کچھ نہیں۔ حق کی طلب سے اس فرمائش کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس لیے ایسا معجزہ دکھانا محض لغو بات ہے۔ مختصر یہ کہ تمھاری ان فرمائشوں کا مقصد بہانہ بازی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے ان کا کوئی مثبت اور عملی جواب نہیں ہو سکتا۔

اب اپنی ایک ایک فرمائش کا منفی جواب سنو!:

عبداللہ! تم کہتے ہو کہ زمین سے چشمے جاری کر دو یا کہتے ہو کہ میرے پاس باغ اور پانی کی نہریں ہونی چاہئیں۔ یہ جہالت اور نادانی کی فرمائشیں ہیں۔ دراصل تم معجزات کی حقیقت سے بے خبر ہو۔ اگر میں وہ سب کچھ کر بھی دوں اور میرے پاس وہ سب چیزیں ہوں جو تم کہتے ہو تو کیا تمھارے خیال میں اس طرح میں پیغمبر ہو جاؤں گا۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے تم یہ کہو کہ اگر میں تمھیں اُڑ کر اور چل پھر کے دکھا دوں تو تم مجھے پیغمبر تسلیم کر لو گے!! کیا تمھارے اور تمھارے دوستوں کے طائف

میں باغ نہیں ہیں ؟ کیا وہاں میں پانی کی نہریں نہیں ہیں ؟ تو کیا تم اِن چیزوں کی بدولت پیغمبر ہو گئے جو میں بھی یہ چیزیں حاصل کر کے پیغمبر بن جاؤں گا ؟ !

رہی تمھاری یہ فرمائش کہ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمھارے سروں پر گرا دوں تو اس صورت میں تو تمھاری موت یقینی ہے ۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ تم اس کے بعد بھی زندہ بچ سکو گے ۔ تم ایسی فرمائشیں کر کے یہ چاہتے ہو کہ خدا کا رسولؐ تمھیں ہلاک کر دے لیکن وہ تو جتنا تم سمجھتے ہو اس سے زیادہ تم پر مہربان ہے وہ تمھاری موت اور ہلاکت نہیں چاہتا بلکہ تمھاری ہدایت کے لیے تمھیں اللہ کی نشانیاں دکھاتا ہے ۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ اللہ کی نشانیاں اس کے بندوں کی پسند پر منحصر نہیں ہوتیں ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بندے جو چاہیں وہی کر دیا جائے کیونکہ شاید اس معاملے میں انسان اپنا اچھا بُرا نہیں سمجھ سکتا ۔ اور اکثر ایسی باتوں کی فرمائش کر بیٹھتا ہے جو اس کے مفاد میں نہیں ہوتیں عبداللہ ! کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی طبیب مریض کی رائے سے اس کے لیے دوا تجویز کرتا ہو یا کوئی قاضی مدّعی اور مستغیث کی منشا کے مطابق اس سے ثبوت طلب کرتا ہو ؟ !

تمھاری یہ فرمائش دائرۂ امکان سے خارج ہے کہ "اللہ اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لاؤ تاکہ ہم انھیں دیکھ سکیں اور ان کی زبانی تمھاری نبوّت کی گواہی سُن سکیں" ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کوئی انسان نہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آئے جائے ،

کسی کے سامنے کھڑا ہو یا اسے دیکھا جا سکے۔ پھر بھی تم ایسی محال اور اَنہونی باتوں کی فرمائش کرتے ہو!!

اور عبداللہ تم جو مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میرا سونے کا مکان ہونا چاہیے تو یہ بھی نبوت کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ شاہانِ مصر سونے کے مکان بنواتے ہیں؟

عبدُاللہ: ہاں سُنا تو ضرور ہے۔

رسول اللہؐ: پھر کیا وہ سونے کے مکان بنوا کر نبوّت کے منصب پر فائز ہوگئے؟

عبداللہ: نہیں۔

رسول اللہؐ: تو پھر سونے کا مکان محمدؐ کو بھی منصبِ نبوّت پر فائز نہیں کرسکتا، میں تمھاری ناواقفیت کا فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے میں سونے کا مکان بنوا کر اپنی نبوّت کے ثبوت میں پیش نہیں کروں گا۔

عبداللہ! تمھارا یہ کہنا کہ میں اُڑ کر آسمان پر جاؤں، وہاں سے خُدا کی دستخطی تحریر لاؤں اور یہ کہ جب تک میں خدا کے پاس سے تحریر نہیں لاؤں گا تم مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے، صرف ایک بہانہ ہے کیونکہ آسمان پر اُڑ کر جانا وہاں سے اُتر کر آنے سے زیادہ مشکل ہے۔ نیز تم خود کہتے ہو کہ ہم تمہارے آسمان پر اُڑ کر جانے سے ایمان لانے والے نہیں۔ تو پھر آسمان سے اتر کر آنے اور وہاں سے چٹھی لانے سے کیا فرق پڑے گا جب کہ تم واشگاف الفاظ میں کہہ چکے ہو کہ یہ سب کچھ ہوجانے کے بعد بھی

معلوم نہیں کہ تم ایمان لاؤ گے یا نہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی نشانیاں دکھائے جانے پر بھی اپنی ضد چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی ضدّی، بہانے باز اور ہٹ دھرم ہیں اس لیے تمھارا جواب تو وہی ہے جو اللہ نے اس آیت میں دیا ہے :

(اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اللہ پاک ہے اور میں صرف ایک انسان ہوں اس لیے مجھے کوئی حق نہیں کہ اللہ کو حکم دوں اور اس سے اپنے دِل پسند معجزے طلب کروں -

جن آیات میں معجزوں کی فرمائش کی گئی ہے، ان کے شانِ نزول سے متعلق یہ ایک روایت تھی جو ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کی - ان آیات کے شانِ نزول کے بارے میں اور بھی متعدد روایات منقول ہیں۔ طبرؔی نے بھی اپنی تفسیر میں ان ہی آیات کے تحت ان روایات کو درج کیا ہے۔
(مؤلّف)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ .